MARCH
2025

حضور
صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم
جانتے ہیں
نعتیہ
مجموعہ
ڈاکٹر سرور
حسین
نقشبندی

غزل

رات لبوں پر کیا کیا برسا ابر تری مہمانی کا
پیاس کا جھولا جھول رہا تھا ایک کٹورا پانی کا

آنکھ میں نیند کا کاجل بھر کے، کھینچ کے خوابوں کے ڈورے
تھپک تھپک کے بھوک سلا دی، جوڑ کے تار کہانی کا

کتنے سیہ فاقوں کے جلو میں کتنی صدیاں بیت گئیں
لیکن پرجا بھول نہ پائی قصہ راجا رانی کا

پتھر چن چن ڈھیر بنایا، چھت کے لیے کڑیاں نہ جڑیں
غربت سب سے بڑا سچ نکلی، جھوٹا مان جوانی کا

کتنی باتیں دل میں رکھ کر، کتنی باتیں کہہ جاتا
میری رگ رگ میں، نس نس میں، زہر تھا گل افشانی کا

تو بھی پڑھ لکھ، اب تو ہوا بھی پڑھنا لکھنا سیکھ گئی
دیکھ گھروندے الٹ رہا ہے شوق ورق گردانی کا

نام چیمبر بیچ میں رکھا، شہرت کی انٹی کے لیے
اہلِ ہوس کی نیت میں تھا بھاؤ بس اک کنعانی کا

کھٹ کھٹ لاٹھی ٹیکتی بڑھیا اور ہواؤں سی کنیا
خشک گھڑونچی پر اوندھا تھا ذوق فرات فشانی کا

چاند کے گھر میں سورج اب کے کتنی راتیں ٹھہرے گا
تیرے لبوں تک کب آئے گا نام ترے زندانی کا

کس دن تک دن پھر جائیں گے کون سے گھاٹ لگائیں گے
مجھ سے تو کھل کر کہہ خالد جھوٹ ستارہ دانی کا

خالد احمد

We support BAYAZ for its role in literary and intellectual development of our society

THE TAQ ORGANIZATION

Logistics Solutions/3PL	Freight Forwarding	Air Cargo Wholesale

We are a different organization in Pakistan

■ Karachi: (021) 34541301-7 ■ Lahore: (042) 36363300-7
■ Sialkot: (052) 3554301-6 ■ Rawalpindi/Islamabad: (051) 5162704-5
■ Faisalabad: (041) 8542924 ■ Peshawar: (091) 5606565 ■ Multan: (061) 4510465

Email: info@tlpk.com Website: www.taq.com.pk
UAN: +92-42-111 222 827

پاکستان میں سب سے زیادہ شائع ہونے والا ادبی جریدہ

بانی مدیر: خالد احمد

جدید تر ادب کا ترجمان

ماہنامہ

بیاض

لاہور

ABC CERTIFIED

جلد نمبر: 33 - مارچ 2025 - شمارہ نمبر: 3

مدیر اعلیٰ: عمران منظور

مدیر: نعمان منظور

مجلس ادارت	اعجاز رضوی	نوید صادق	کنور امتیاز احمد	جاہد احمد

تزئین و آرائش: ہیثم عمران

کمپوزنگ: حافظ محمد عبداللہ

سرورق:

قیمت: 100 روپے

سالانہ زر اعانت 1000 روپے بیرون ملک 100$ یا پاکستانی روپے میں
فیصل بینک لمیٹڈ
ای ایم ای ہاؤسنگ سوسائٹی، لاہور
A/c Title: Monthly BAYYAZ
اکاؤنٹ نمبر: 0256007000002582

بیاض گروپ آف پبلی کیشنز

سید اطہر شہید روڈ 16 کلومیٹر ملتان روڈ لاہور- 53700

فون: 3-92-42-37513000 فیکس: 92-42-37512517

Email: bayaz@trackntie.com www.trackntie.com

ویب سائٹ برائے مطالعہ
www.trackntie.com
BAYAZ

عمران منظور ایڈیٹر پبلشر اور پرنٹر نے ٹریک اینڈ ٹائی پرنٹرز 16 کلومیٹر زمان ٹاؤن گلی اطہر شہید روڈ ملتان روڈ لاہور سے چھپوا کر دفتر بیاض سے شائع کیا

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

رَبِّ لَا تَذَرْنِیْ فَرْدًا وَّاَنْتَ خَیْرُ الْوٰرِثِیْنَ

اے میرے پروردگار! مجھے اکیلا نہ چھوڑ اور تُو سب وارثوں سے بہتر ہے۔

اشاریہ

نمبر شمار	عنوان	مصنف / مصنفہ	صفحہ نمبر
1	حمد	حسن عسکری کاظمی	7
2	نعت	آصف ثاقب، حسن عسکری کاظمی، سید ریاض حسین زیدی، اکرم ناصر سرور حسین نقشبندی، محمد یٰسین قمر، فرحت عباس، محمد اشفاق بیگ	8 تا 15
3	عقیدت	شاہ محمد سبطین شاہجہانی، محمد انیس انصاری، احمد جمیل مرزا آصف رسول، رضا اللہ حیدر، فیض رسول فیضان	16 تا 22
4	رباعیات	محمد نصیر زندہ	23
5	ہائیکو / ترونی	حامد یزدانی، محمد علی ایاز، وکل گل	24 تا 26
6	مضامین	جلیل عالی، نسیم سحر، خاور اعجاز، حامد یزدانی، مسعود احمد حنیف باوا، محمد نوید مرزا، ریاض ندیم نیازی، شجاعت علی راہی محمد طارق عمی، افتخار الحق، عنبرین حسیب عنبر، ہمایوں خان محمد افراہیم بٹ، صدام ساگر	27 تا 97
7	طنز و مزاح / خاکے	نور کمال شاہ، علی رضا احمد، اعجاز رضوی	98 تا 110
8	غزلیں	خالد احمد، آصف ثاقب، جلیل عالی، حسن عسکری کاظمی اعجاز کنور راجہ، نسیم سحر، سید ریاض حسین زیدی، نثار ترابی صفدر صدیق رضی، طارق بٹ، سعد اللہ شاہ، علی اصغر عباس	111 تا 202

نمبر شمار	عنوان	مصنف / مصنفہ	صفحہ نمبر
8	غزلیں	شریف ساجد، اقبال قمر، راحت سرحدی، ابوطالب انیم شاہین عباس، سید انصر، شاہد اشرف، محمد انیس انصاری خورشید ربانی، اکرم ناصر، افتخار شاہد، عقیل رحمانی اقبال سروبہ، مسعود احمد، ذکی طارق، شمشیر حیدر، سجاد بلوچ نائلہ راٹھور، افروز رضوی، انصر حسن، احمد جلیل، محمد نوید مرزا آفتاب خان، شوکت محمود شوکت، اجمل اعجاز، حمزہ یعقوب شبہ طراز، محمد اشرف کمال، اعجاز دانش، اکرم سحر فارانی اقبال ناظر، عرفان صادق، اعجاز روشن، راجہ عبدالقیوم نبیل احمد نبیل، خالدہ انور، اکرم جاذب، سعدیہ بشیر صغیر احمد صغیر، امر مہکی، عابد رضا، ساجد رضا خان سرور فرحان، ارشد محمود ارشد، علمدار حسین، ملیحہ سیّد خالد ندیم شانی، سید محمد انجم معین بلے، بشیر احمد حبیب شاہد فرید، نوید عاجز، ساگر حضور پوری، مرزا سکندر بیگ ظہور چوہان، کیفی قلندر، وسیم جبران، افضل ہزاروی محمد افضال انجم، ردا حاصل خلوص، الماس شمی اورنگزیب حسام حر، جیا قریشی، رخسانہ سمن، نعمان محمود عنایت اللہ عنایت، زاہد محمود زاہد، مستحسن جامی محمد عرفان خان، سلیم اختر، شاہد شوق، کومل جوئیہ، ندیم ملک قیصر مسعود، انتظار سید، اکرام الحق سرشار، قمر نیاز محمد حسنین پرویز، عبدالرؤف زین، نوید صادق	111 تا 202
9	افسانے	سلمان یوسف سیمجہ ، فصیحہ آصف خان [جیفرے آرچر / ترجمہ: پیروز بخت قاضی] ، بشریٰ شیریں	203 تا 226
10	مائکرو فکشن	کنزیٰ خالق، محمد اویس	227 تا 229
11	نظمیں	جلیل عالی، محمد انیس انصاری، طالب انصاری حامد یزدانی، منظور ثاقب، علی اصغر عباس، عنبرین صلاح الدین احمد جلیل، امجد بابر ، نائلہ راٹھور	230 تا 241

حمد

تو کہ ہے خالق مطلق تری قدرت کے نثار
ہر طرف تیری ہی قدرت کے ہیں پیدا آثار

تیری تخلیق کے انداز نرالے پائے
تو نے ہر رنگ میں پھولوں کے لگائے انبار

نیل گوں کتنی ہے خوش رنگ فلک کی چادر
کتنے سیارے، ستارے ہیں نہیں جن کا شمار

بحر و بر، شمس و قمر، کوہ و بیاباں تیرے
خوش نما کھیتیاں تا حدِ نظر ہیں اشجار

تیری مخلوق کی اقسام نہ گن پائے کوئی
اک زمانے سے ہے حیراں مری چشمِ بیدار

سب ترے زیرِ نگیں، تیرے کرم کے محتاج
وہ کہ صحرا ہوں، سمندر ہوں کہ اونچے کہسار

میں ترا بندۂ بے دام ہوں میرے مولا!
تو ہے مالک مرا میں کیسے کروں گا انکار

نعمتِ شعر و سخن تو نے عطا کی مجھ کو
سرنگوں نوکِ قلم میرے گنہ کا اقرار

میں کہ ہوں حمد سرا حرف ہیں بے چہرہ مرے
تری عظمت کا یقیں میرے ہنر کا اظہار

حسن عسکری کاظمی

نعتؐ

نبیؐ کا آشیانہ مل رہا ہے
ہمیں رستہ پرانا مل رہا ہے

ہماری فیض یابی ہو رہی تھی
محمدؐ کا خزانہ مل رہا ہے

انھیںؐ مانگا ہے ہم مانگا کریں گے
دعاؤں کا بہانہ مل رہا ہے

دلی اخلاص کی حد ہے زیادہ
ہمیں آگے زمانہ مل رہا ہے

مدینے سے ہمیں ملتی ہے رحمت
یہیں سے آب و دانہ مل رہا ہے

ہمیں مکّے مدینے کی عطا سے
سکونِ جاودانہ مل رہا ہے

دعا سے آپ کی ہم کو خدا سے
سلوکِ عادلانہ مل رہا ہے

درودِ پاک سے ہم کو بھی ثاقب
قرارِ بیکرانہ مل رہا ہے

آصف ثاقب

نعتؐ

دستورِ زندگی ہوا فرمانِ مصطفیٰؐ
پیشِ خدائے پاک ہے کیا شانِ مصطفیٰؐ

اصحابِ باوفا میں ہیں بوذرؓ، بلالؓ بھی
رفعت مآب دیکھا دبستانِ مصطفیٰؐ

انسانیت کی قدر ہے معراجِ بندگی
سجدہ فقط ہے شکر کا ارمانِ مصطفیٰؐ

مسلم مثالِ گل ہیں کہ رنگت جدا جدا
آباد کس قدر ہے گلستانِ مصطفیٰؐ

ہم خوش نصیب سایۂ رحمت میں آگئے
جنت کا ایک گوشہ ہے دامانِ مصطفیٰؐ

اپنے لہو میں آپ نہانا ہے زندگی
ہے خوش نصیب جو ہوا قربانِ مصطفیٰؐ

ختم الرسلؐ کو حجتِ آخر بنا دیا!
تا حشر اک نظام ہے فرقانِ مصطفیٰؐ

بستر پہ کون سویا کسی کو خبر نہیں
خالق ہے ہر قدم پہ نگہبانِ مصطفیٰؐ

زیرِ کساء ہیں طاہر و اطہر علی ولی
خیرؑ النساء حسینؑ و حسنؑ جانِ مصطفیٰؐ

حسن عسکری کاظمی

نعتؐ

ہے تلاش راہ حق میرا ہدف
اے خدا! لے جا مدینے کی طرف

آپؐ کا پیغام حق ہے جا بجا
مکہ بھی ہو، یا مدینہ یا نجف

آپؐ کی توصیف میں ہوں منہمک
ہے مبارک آفریں! میرا شغف

ہیں ریاضِ نعتؐ میں سرشاریاں
میرا رخ ہے سبز گنبد کی طرف

آپؐ نے توحید کو واضح کیا
اتحادِ باہمی ہو صف بہ صف

حرف کن کی غرض و غایت آپؐ ہیں
جو بھی ہے، سب آپؐ کا ہے ہر طرف

آپؐ ہی کا ہر عمل ہے معتبر
راویانِ ضعف پرور ہر طرف

آپؐ کی آمد سے چہرے کھل اٹھے
کیا بجائی بچیوں نے خوب دف

آپؐ کا جو بھی ہے دشمن بے سبب
ہم بھی ہیں اس کے لیے خنجر بکف

سید ریاض حسین زیدی

نعتؐ

جو بظاہر نظر آتا ہے، یا جو راز میں ہے
جو بھی کچھ ہے، وہ حضور آپ کے اعزاز میں ہے

گفتگو آپ کی، حیران تھے سب اہلِ زباں
کیا فصاحت میں، بلاغت میں ہے، ایجاز میں ہے

آپ کو لایا گیا اتنا قریب اتنا قریب
اور بھی ایسا، کسی اور کے اعزاز میں ہے

اس معلم کو جو تفویض ہوئیں، ان جیسی
کیا کوئی ایک بھی خوبی کسی استاذ میں ہے

کاش ہو جائے مجھے آپ کا انداز نصیب
حسن جیون کا، فقط آپ کے انداز میں ہے

اس پہ اترا تھا جو انسان وہ لاثانی تھا
یہ زمیں آج بھی اس فخر میں، اس ناز میں ہے

جانے کیا کچھ ترے قرآں نے کیا ہے افشا
جانے کیا کچھ ہے 'جو اخفا میں ہے' جو راز میں ہے

اس میں پھیلی تری سانسوں، تری باتوں کی مہک
یہ مدینہ کی فضا، آج بھی اس ناز میں ہے

ان کا یاں آنا، یہاں رہنا ہی کچھ کم تو نہ تھا
گنبدِ خضریٰ مدینہ! تو بجا ناز میں ہے

آج بھی نعت نبی، شوق سے لکھتے ہیں سبھی
طائرِ عشقِ نبی، آج بھی پرواز میں ہے

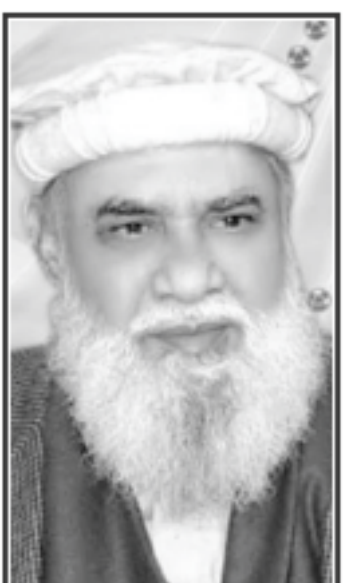

اکرم ناصر

نعتؐ

جب اشک چشمِ پشیمان سے نکل آیا
میں مشکلات کے طوفان سے نکل آیا

درود پڑھنے کا اک فائدہ ہوا یہ بھی
میں بے یقینی کے نقصان سے نکل آیا

پئے نجات بہانے کی تھی تلاش مجھے
سو رستہ نسبتِ حسان سے نکل آیا

وہ بے نیاز کیا ان کے ذکر نے مجھ کو
میں دامِ خواہش و ارمان سے نکل آیا

متاعِ عمر رواں ہو جو شان کے شایاں
جو ایک شعر بھی دیوان سے نکل آیا

ہوئی جو نعت تو میں شکر کرنا چاہتا تھا
وظیفہ سورۂ رحمان سے نکل آیا

ہرا بھرا مجھے رکھتا ہے سبزۂ مدحت
میں مطمئن ہوں بیابان سے نکل آیا

مدینے جا کے کہا زائرِ حرم نے مجھے
تمہارا دل مرے سامان سے نکل آیا

ہوئیں حضور کی ایسی نوازشیں سرور
میں دنیا داروں کے احسان سے نکل آیا

سرور حسین نقشبندی

نعتؐ

خود پہ ہوتے ہوئے کرم کی یاد
آگئی آپؐ کے حرم کی یاد

مشکبو کر رہی ہے فکر و نظر
شاہؐ کے شہرِ محترم کی یاد

اسمِ احمدؐ رقم کیا جس سے
مٹ نہ پائے گی اس قلم کی یاد

اے خوشا ! لطف و نعمتِ باری
اے خوشا ! طیبۂ نِعم کی یاد

آنکھ سے ہو گئے رواں آنسو
ہائے ”جیرانِ ذی سلم“ کی یاد

بدر و احزاب و خیبر و ہجرت
آپؐ کی عظمتِ ہمم کی یاد

ہے فقیرِ حزیں کا سرمایہ
ذاتِ پاکِ شہِ اُممؐ کی یاد

اے قمر سربسر منوّر ہے
اس کریمؐ اور محتشمؐ کی یاد

محمد یٰسین قمر

نعتؐ

نبیؐ کے عشق کو ایقان کرنا چاہتا ہوں
میں دل کو صاحبِ ایمان کرنا چاہتا ہوں

مدینہ پاک کی گلیوں میں وقت گزرے مرا
میں خود کو آپؐ کا مہمان کرنا چاہتا ہوں

مرے نصیب کا گلشن درود والا رہے
میں دل کا دشت خیابان کرنا چاہتا ہوں

جہاں پہ ذکر ہو صلِ علیٰ محمدؐ کا
میں اُس جہاں کو گلستان کرنا چاہتا ہوں

خطا شعار بفیضِ درود ہوں معصوم!
میں کاتبین کو حیران کر چاہتا ہوں

ملے جو خاکِ مدینہ تو اس کے صدقے میں
میں اپنی جان بھی قربان کرنا چاہتا ہوں

قدم قدم پہ ہو یادِ رسولؐ کا منظر
میں اپنی راہ کو آسان کرنا چاہتا ہوں

مدینے والے کا سایہ ازل سے ہے سر پر
میں اپنے دل میں یہ عرفان کرنا چاہتا ہوں

جہاں جہاں بھی اذانوں کی گونج آتی ہے
وہیں میں ذکر کا میدان کرنا چاہتا ہوں

یہ زندگی جو بسر ہو رہی ہے غفلت میں
نبیؐ کے نام پہ قربان کرنا چاہتا ہوں

مدینہ دیکھ کے پلکیں جھپک نہ پائیں کبھی
میں اپنے خواب بھی سب دان کرنا چاہتا ہوں

لبوں پہ آپؐ کا آقاؐ سدا ترانہ ہرے
میں نعت زیست کا عنوان کرنا چاہتا ہوں

یہ ایک نعت فقیری کو معتبر ٹھہرے!
ہر ایک لفظ کو ذیشان کرنا چاہتا ہوں

میں چاہتا ہوں بہر دم رہے لبوں پہ درود
ہر ایک سانس مسلمان کرنا چاہتا ہوں

ہمیشہ دل میں رہے عشقِ مصطفیٰ فرحت
کچھ آخرت کا بھی سامان کرنا چاہتا ہوں

فرحت عباس

نعتؐ

کروں میں سبز گنبد کا نظارہ یارسول اللہ
حضوری کی اجازت ہو خدارا یا رسول اللہ

ترے روضے کی جالی چوم لوں آنکھوں سے حسرت ہے
جدائی اب نہیں مجھ کو گوارا یا رسول اللہ

مرے آقا مجھے بلوایئے اک بار روضے پر
مقدر کا مرے چمکے ستارا یارسول اللہ

مرے آقا نے جس جس جا پہ اپنے پاؤں رکھے ہیں
وہ خاک پا ہے میرے غم کا چارا یا رسول اللہ

یہ جسم و جاں مرے آقا عطا تیری کرم تیرا
میں قرباں آپ پر سارے کا سارا یارسول اللہ

نہ جانے روز محشر عاصیوں کا حال کیا ہوتا
نہ ملتا گر شفاعت کا سہارا یارسول اللہ

بس اک نظرِ کرم اشفاق پر بھی کیجیے آقا
نہ جاؤں چھوڑ کر اب در تمھارا یارسول اللہ

محمد اشفاق بیگ

عقیدت

دین و دنیا کی جسے دنیا میں دانائی ملی
سرزمینِ عقل و دِل کی اُس کو دارائی ملی

نعت کے دیپک جلے یادِ مقدس کے طفیل
آپ کے اذکار سے لفظوں کو گویائی ملی

چار جانب آپ کے خُدام کا شُہرہ ہوا
آپ کے دُشمن کو ہر جانب سے رُسوائی ملی

کائنات جان و دل تھی کس قدر بے رنگ و بو
تیرے زیب و زین سے عالم کو زیبائی ملی

محفلِ میلاد سے دونوں مُرادیں مِل گئیں
ذہن کو نُورِ محبت ، دِل کو بینائی ملی

فاطمہؓ زہرا کی خاکِ پا سے دِل روشن ہوا
اہلِ دِل دیکھو مجھے یہ کیسی رُشنائی ملی

حضرتِ مولا علیؓ مُشکل کُشا کے فیض سے
اوجِ نسبت دیکھئے نسبت بھی مولائی ملی

کوہِ فاراں سے جو اُبھرا آفتابِ نورِ حق
کفر زارانِ جہاں کو خوب پسپائی ملی

خواجگانِ چشتیہ کا سر پہ سایہ ہے مرے
نسبتوں کے رنگ سے یہ کیسی رعنائی ملی

رحمتہ العالمینؐ ہیں نورِ رَبُ العالمیں
اہلِ دانش سوچیے یہ کس کو یکتائی ملی

عِشقِ ماہِ مُرتضیٰؓ سے نعت کا طُغرا ملا
حُسنِ نُطقِ مصطفیٰؐ سے اوجِ گویائی ملی

جو نکل آئے طلب میں سرحدِ ادراک سے
اُن کے اِستقبال کو دُنیا کی دانائی ملی

جب تصور میں دمک اُٹھیں سنہری جالیاں
ذِکرِ حق سے جلوہ گُستر دِل کی انگنائی ملی

چہرۂ والفجر کا صدقہ ضیائیں مل گئیں
گیسوئے واللیل کے صدقے سے لیلائی ملی

ساری دُنیا کس کے حُسنِ نور سے نورین ہوئی
بینشِ عالم کو کس کے دَم سے بینائی ملی

باغِ بطحا کی نسیمِ جانفزا کے فیض سے
لہکی لہکی ، مہکی مہکی ، آج پُروائی ملی

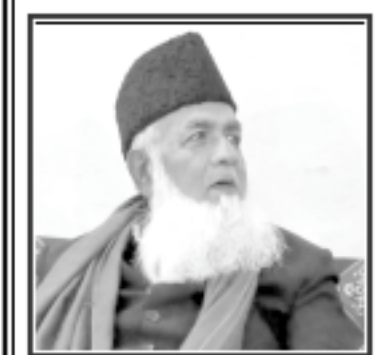

شاہ محمد سبطین شاہجہانی

عقیدت

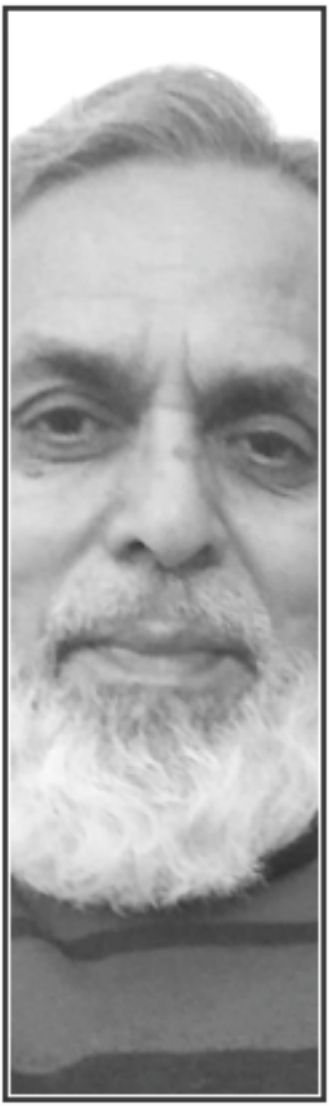

حج ملاقات کا بہانہ ہے
اُس دِیئے سے دیا جلانا ہے

کوئی اِک لمحۂ وصال کوئی
مختصر سا یہی فسانہ ہے

شہرِ طیّب کے اک مسافر کو
آٹھ دن بعد لوٹ جانا ہے

کیسے جائے سلامِ آخر کو
جس کو یاں بار بار آنا ہے

جس کو زیبا ہے چادرِ تطہیر
پنجتن پاک کا گھرانا ہے

واپس آکر بھی ہے سوال وہی
میرے آقا نے کب بُلانا ہے

ہو چکا گردِ راہ ، جانِ انیس!
کیوں مری کھوج میں زمانہ ہے

محمد انیس انصاری

عقیدت

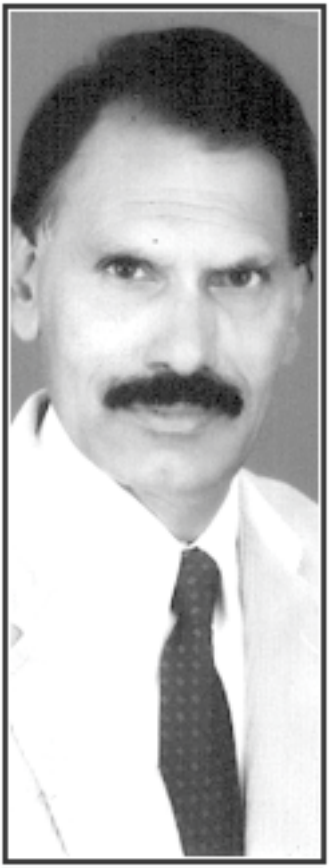

آلودہ تھا کتنا میں عنایات سے پہلے
اُس رحمتِ بے پایاں کی برسات سے پہلے

ڈھونڈا ہے مرے دستِ دعا نے یہ قرینہ
پڑھتا ہوں درود اُن پہ مناجات سے پہلے

ہوتا ہے وہاں تنگیٔ داماں کا احساس
جو شکوہ کناں رہتے ہیں حالات سے پہلے

اس صاحبِ قرآن کا اعزاز ہے یہ بھی
وہ آئے تھے قرآن کی آیات سے پہلے

اُس در سے جلیل آئے ہیں وہ جھولیاں بھر کے
تھکتے نہ تھے جو شکوۂ حالات سے پہلے

احمد جلیل

انتخاب

- خالد احمد -

نعمان منظور

خالد نمازِ مدح ادا ہو تو کس طرح
کس نم مہک سے تیرے ثناگر وضو کریں

الحمدللہ

سرِ تحدیثِ نعمت حرزِ جاں الحمدللہ
ضمیرِ شکر کا ہے ترجماں الحمدللہ

ہر اک تعریف کے اللہ لائق ہے اور اس کا
ہے قرآنِ مبین زریں بیاں، الحمدللہ!

ہیں بسم اللہ کی تنویر وہ منذر مبشر
حق اُن کے مُنہ سے خود رطب اللساں، الحمدللہ!

ہے سیکھا عقل و دل نے اسوۂ خیر البشر سے
ہمیں کہنا ہے کب، کیسے، کہاں؟ الحمدللہ!

ہے اُس کی حمد کی باب ربوبیت کا صفحہ
یہ ساری کائنات کن فکاں الحمد للہ!

شہود و غیب و فوق و تحت و دوش و حال و فردا
ہیں اُس کی حمد کے سب این و آں الحمدللہ!

ہیں اس کی حمد سے احمدؐ محمدؐ اور وہ محمود
ہیں اُن کی ضو سے جانِ حامداں الحمدللہ!

وہ القدوس ہے وہ السلام اس کے محامد
تنِ ہستی کے ہیں روح و رواں الحمدللہ!

وہ الجبار ہے وہ العزیز اس سے وفا کا
ہے ذرہ ذرہ ہر دم مدح خواں الحمدللہ!

وہ الخالق وہ الباری وہی ہے المصور
ہر اک شے اس کی قدرت کا نشاں الحمدللہ!

وہ الظاہر وہ الباطن جدا ہو کر بھی سب سے
ہے سب کے ساتھ سب کے درمیاں، الحمدللہ!

اُسے اللہ کہیے چاہے الرحمٰن کہیے
ہیں اُس کے اسم سب احسن یہاں، الحمدللہ!

وہ علم و فلسفہ احساس اور فطرت کے مابین
خرد سے ہے نہاں دل پہ عیاں، الحمدللہ!

وہ جلوہ گر ہے ایسے عرش ایمان و یقیں پر
ہے جس سے بے خبر وہم و گماں، الحمدللہ!

خود اپنے نفس کا عرفاں کھلا دیتا ہے دل میں
خدا کی معرفت کا بوستاں، الحمدللہ!

وہ رب العالمین اپنے کرم کی ہر ادا میں
ازل سے ہے ابد تک مہرباں، الحمدللہ!

وہ الرحمٰن ہے وہ الرحیم اس کا در لطف
وہیں ہے کوئی سائل ہو جہاں، الحمدللہ!

ہم اپنی لغزشوں کی دھوپ میں ہیں پھر بھی ہم پر
ہے اُس کی مغفرت کا سائباں، الحمدللہ!

ہے مشتِ خاک کو وہ آرزو دی اس نے گویا
دلِ قطرہ میں ہے دریا رواں، الحمدللہ!

سمندر موجزن ہے جیسے اُس کی رحمتوں کا
عطائیں بھی ہیں اس کی بیکراں، الحمدللہ!

یہ دنیا مزرعت ہے آخرت کی اور وہ عقبیٰ
جزا کا ہے جہانِ جاوداں، الحمدللہ!

جہاں دے گا سرِ محشر سزا وہ مجرموں کو
وہیں اُس کا ہے دامانِ اماں، الحمدللہ!

عمل دیں گے گواہی آپ میزاں سے کسی کی
ہیں کیسی خوبیاں، کیا نیکیاں، الحمد للہ !

بشارت الوسیلہ کی بھی ہے ہم عاصیوں کو
محمد ہیں شفیع مذنباں ، الحمدللہ!

عبودیت عبادت عید پر معبود کا حق
یہی مقصودِ خلقِ انس و جاں ، الحمد للہ !

عبادت مسجد و معبد سے آگے کی مسافت
عبادت ہی رحیلِ کارواں ، الحمدللہ!

ہر اک طاغوت سے انسان کے حق میں سوے لاہوت
عبادت حُریت کی ہے اذاں ، الحمد للہ !

عبادت ہے خود آگاہی عبادت سے بشر پر
ہے گھلتا اُس کے اندر کا جہاں ، الحمد للہ!

متاعِ استعانت ہے غنا ہر ماسوا سے
وہی اک ہے معین و مستاں ، الحمد للہ !

نصابِ استعانت حمد و تسبیح ہو عنابت
ہیں استمداد میں کون و مکاں ، الحمد للہ !

توکل ، تزکیہ ، تقویٰ کی طاقت استعانت
ہیں جذبے استعانت سے جواں ، الحمدللہ!

نگاہِ استعانت پھر کہیں ڈھونڈھے کسے؟ جب
ہے مولا خود نصیر بندگاں ، الحمد للہ!

صراط مستقیم اسلام و ایماں سے عبادت
ہے احساں کی حسیں تر داستاں ، الحمدللہ!

صراطِ مستقیم ایسی عزیمت کا ہے جادہ
جو ہے خود امتحاں ، خود کامراں ، الحمدللہ!

صراط مستقیم اہل وفا کا ہے وُہ رستہ
کہ ہے گویا زمیں بھی آسماں ، الحمد للہ !

شہیدان جہادِ حق کی ہے ہر زیست ممنوں
ہے اُن کا افتخار و امتناں : الحمد للہ !

ہے صلحِ کُل اور اصلاحِ عمل اُن کا خزانہ
اور اِس سے بڑھ کے گنجِ صالحاں: الحمدللہ!

نبوت پھر شہادت پھر صداقت، صالحیت
بڑھائی سب کی اُس منعم نے شاں، الحمدللہ!

بچے گر ہر کوئی اُس کے غضب سے، گم رہی سے
کسی کا کچھ نہیں پھر رائیگاں ، الحمد للہ !

سراسر خیر ہے وہ، منفعت اُس کی مشیت
نہ ہے منظور اُسے شر نے زیاں ، الحمدللہ!

ہوں آصف اس میں جسم و جاں بھی وقف اس سے زیادہ
کہ جتنا ہے ابھی وردِ زباں ، الحمد للہ !

مرزا آصف رسول

عقیدت

مصائب کے بھنور میں ہیں، مرا مولا، نکالے گا
اندھیری رات میں بھی وہ کوئی تارا نکالے گا

وہ قادر ہے کرم فرمائے گا بے بس غلاموں پر
مرے اشکوں کو دیکھے گا نیا رستا نکالے گا

تمناؤں کی ویراں ہیں اگرچہ کھیتیاں ساری
وہ سیرابی کرے گا اور گُلِ تازا نکالے گا

مرے پنچھی تو گن گاتا ہے جس خالق کے ہر لحظہ
تجھے مہکی فضاؤں میں بہت اونچا نکالے گا

نوازے گا ہماری خشکیوں کو نم کی دولت سے
وہ صحراؤں کے سینے سے کئی دریا نکالے گا

رضا صبح و مسا ربِ علی سے التجائیں کر
ترا یہ گڑ گڑانا عفو کا چشمہ نکالے گا

رضا اللہ حیدر

انتخاب

- خالد احمد -

نعمان منظور

ان کے ذکر کا ہالہ ٹھہرے ، کیا عجز اظہار
وہ جان جاں وہ آقا ، وہ دلبر وہ دلدار

لیلۃ القدر

لیلۃ القدر ہے چشمِ تر مانگ لو
دردِ دل اور سوزِ جگر مانگ لو

آج جو سوئے گا بعد میں روئے گا
آج اللہ سے جاگ کر مانگ لو

رب سے پھر تم کو سب کچھ ہی مل جائے گا
رب کے محبوب کے نام پر مانگ لو

مشکلیں ساری آسان ہو جائیں گی
اُن کی رحمت کی بس اک نظر مانگ لو

اُن کی رحمت ہے جوبن پہ آئی ہوئی
مانگ لو آج دل کھول کر مانگ لو

جو جھکے اور دھڑکے بس اُن کے لیے
ایسا دل مانگ لو ایسا سر مانگ لو

جیتے جی جنتوں کا مزہ آئے گا
بس مدینے میں چھوٹا سا گھر مانگ لو

رحمتوں برکتوں سے بھری ہے یہ شب
شام سے تا بوقتِ سحر مانگ لو

دُور ہو جائیں گی دل کی تاریکیاں
جلوۂ نورِ شمس و قمر مانگ لو

منزلیں خود کریں گی طوافِ قدم
کوئی اہلِ نظر ہم سفر مانگ لو

سر بلندی کی فیضان چھوڑو ہوس
شاہ کونین کا سنگِ در مانگ لو

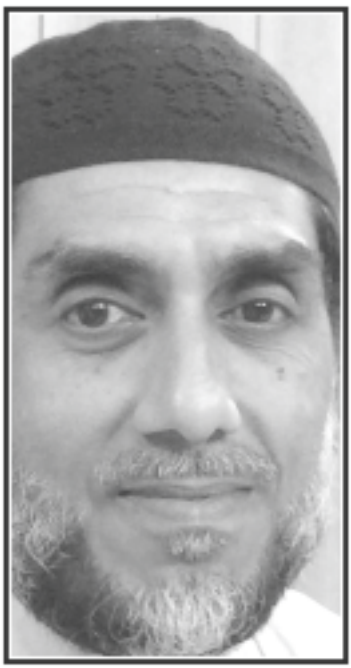

فیض رسول فیضان

رباعیات

شیشے کو پری رنگِ گماں زاد نے دی
معنی کو سواری حرفِ ایجاد نے دی
بینائی عطا کرتا ہوں الفاظ کو میں
مجھ کو دادِ سخن ہر استاد نے دی

.....

پیمانۂ آرزو کو پیاسا نہ کرے
قطرہ نہ سہی شوق کو دریا نہ کرے
اک میں کہ رُخِ خیال کو بوسے دوں
اک وہ کہ گمان بھر تمنا نہ کرے

.....

دل خلد کی جاگیر میں رہنے کا نہیں
میں کوچۂ تصویر میں رہنے کا نہیں
بولو کہ اسیرِ قفس آواز ہے کب
غل حلقۂ زنجیر میں رہنے کا نہیں

.....

اس سر میں پڑی ہے خاک مے خانے کی
ہے خاک حقیقت مرے افسانے کی
پیمانے بناتا ہوں اسی خاک سے میں
خورشید کرن ہے مرے پیمانے کی

.....

کہسار ستارہ آستیں ہوتا ہے
نظارہ فلک پوش یہیں ہوتا ہے
آتی ہے مجھے کوثر و تسنیم کی بو
کشمیر سے جنت کا یقیں ہوتا ہے

.....

تصویر نما عکسِ مکافات بنے
پیمانہ مرا چشمِ خیالات بنے
بے چہرہ عداوتیں ہیں آئینہ فریب
دل سایہ تراش ہو تو کچھ بات بنے

.....

آشوبِ ستم بدوش ہوتے ہیں یہی
طوفانِ فتنہ پوش ہوتے ہیں یہی
ہوتے ہیں بت تراش آزادی کے غم
تقدیرِ خدا فروش ہوتے ہیں یہی

.....

روٹی کو عبادت کا حشم دیتا ہے
دستورِ حرم پیٹ کا غم دیتا ہے
باغی قسمت تراش لاتی ہے صنم
افلاس خداؤں کو جنم دیتا ہے

.....

شمشیرِ قلم کتاب کی بیٹی ہے
یہ روشنی آفتاب کی بیٹی ہے
ہوتی ہے عروسِ دار کا پیراہن
آزادیِ انقلاب کی بیٹی ہے

محمد نصیر زندہ

ہائیکو

سبز راہیں مہکنے لگتی ہیں
نیلی چڑیوں کے لوٹ آنے سے
جھاڑیاں بھی چہکنے لگتی ہیں

O

گدلا گدلا سا آج امبر ہے
دُور تک اک سفید چادر سی
برف باری ہے اور دسمبر ہے

O

آج کل یوں وجود حرف کا ہے
جس طرح دھوپ کے نکلنے تک
خشک ٹہنی پہ پھول برف کا ہے

O

خواہشیں ظرف میں دبی ہوئی تھیں
چاندنی دور تک پھسلتی گئی
سیڑھیاں برف میں دبی ہوئی تھیں

O

پھر دبے پاؤں شب گزرتی رہی
خواب تو جل بجھا تھا آنکھوں میں
روشنی نیند میں بکھرتی رہی

نکھری نکھری سی گھاس پُرنم ہے
کیسا دل کش ہے یہ سماں ، حامد
جھیل ہے ، شام ہے ، تِرا غم ہے

O

ہاؤ ہُو بن گئی ہے اک دیوار
خامشی تھی تو رابطے تھے بہت
گفتگو بن گئی ہے اک دیوار

حامد یزدانی

ہائیکو

محمد علی ایاز

خواہشوں کے جنگل میں
میں نے اپنی سانسوں سے
زندگی جلا ڈالی

اک ترے اشارے پر
ہم چلے تو آئے ہیں
آخری کنارے پر

ریختہ کی بستی میں
میں نے چند مصرعوں سے
اک مکاں بنایا ہے

دھوپ کی سرائے میں
ایک دن ریسپشن پر
چھاؤں بیٹھی ہوئی دیکھی تھی

انتخاب

- خالد احمد -

نعمان منظور

ہمیں اچھا نہیں لگتا کہ رکھیں
تنِ بیمار میں بیمار دل بھی

تروینی

جانے والے! تو جانتا ہی نہیں
کتنی دلگیر ہے یہ دیوانی
ہجرتوں کے اداس موسم میں

....

بن تیرے مجھ کو چین کہاں
من موہنا، وہ سنگیت نہیں
پہلی سی تیری پریت نہیں

....

آگ کے جلانے سے
روٹیاں پکانے تک
کتنے شعر ہوتے ہیں!!

....

کب ہو گا گیت مرا پورا
ہر بار کمی سی، اس میں لگے
گر ساز ہے تو، وہ میت نہیں

....

مایوس نہ ہو کوکی!
آئے گی تری باری
کچھ بھی یہاں ہے ممکن
عمر بھر انتظار تو کر لوں
وقت کی ڈور کو یونہی کب تک
تھام کے روکتی رہوں گی میں

....

آج پھر رابطہ ہوا ان سے
گزری باتوں پہ بحث کی ہم نے
آج پھر مجھ پہ شاعری اتری

....

کون سا جرم کر لیا میں نے؟
پھول کلیاں ہی دیکھنا چاہیں!
خواب آنکھوں کے چھن گئے میرے

....

ہر گھڑی بھروسے کو
توڑ کر گیا ہے وہ
میں مگر نہیں ہاری

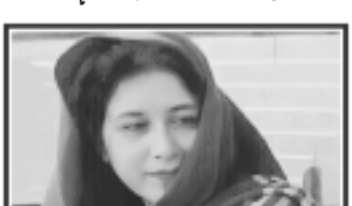

کوکی گل

''لکیروں پر نہیں چلتے'' [ایک تعارفی و تجزیاتی گفتگو: ترقیم عمر عزیز]

عمر عزیز کے مجموعہِ نظم ''لکیروں پر نہیں چلتے'' کو میں اس کی اشاعت سے پہلے پڑھ چکا ہوں۔ مگر کتابی شکل میں پڑھنے کا تجربہ ایک مختلف تجربہ ہوتا ہے۔ بلکہ جب میں ذرا بے چین ہوا اور میں نے عمر عزیز سے کہا کہ آپ کی کتاب نہیں پہنچی تو بولے کہ آپ کی نظر سے تو ساری چیزیں گزر چکی ہیں۔ میں نے کہا کہ وہ نظر اور ہوتی ہے، میں ایک قاری کی نظر سے پڑھنا چاہتا ہوں۔ پھر ظاہر ہے میں اس تجربے سے گزرا۔ سب سے پہلے تو یہ بات بہت ہی قابلِ ستائش ہے کہ عمر عزیز ایک ایسے پیشے سے وابستہ ہے جس کا چیر پھاڑ کے ساتھ تعلق ہے اور اس پیشے کی جو روٹین ہے، وہ اقبال کے اس شعر:

ہے دل کی لیے موت مشینوں کی حکومت
احساسِ مروت کو کچل دیتے ہیں آلات

.....

کے مطابق احساسِ جمال کو سلب کرتی چلی جاتی ہے۔ اس لیے عمر عزیز کی طرح کے بندے کو دوہری لڑائی لڑنی پڑتی ہے۔ ایک اپنے پیشے کی روٹین سے، جو اس کی نرمی، لطافت اور شائستگی کے لیے ایک چیلنج کی حیثیت رکھتا ہے۔ اور دوسری طرف شعر و ادب کے شعبے میں اپنے اردگرد اسی شعبے میں معیار کو سامنے رکھتے ہوئے اپنے لیے جگہ بنانے کی کوشش۔ عمر عزل بھی کہتے رہے مگر یہ کتاب خالص نظموں کی کتاب ہے۔ ابھی نظم کے صاحبِ طرز ممتاز شاعر ڈاکٹر وحید احمد نے گفتگو فرمائی۔ ان کی باتوں سے میرے اس خیال کو تقویت ملی کہ سکہ بند نقادوں کے مقابل جب ایک اصیل تخلیق کار کوئی تنقیدی نکتہ بیان کرتا ہے تو وہ یوں کوزے میں دریا بند کر دیتا ہے کہ اس میں سے کتابیں نکل سکتی ہیں۔ اور خود تنقید نگاروں کو نئے زاویے اجاگر ہوتے ہیں۔ کیونکہ جس تخلیقی کرب سے ایک تخلیق کار گزر کر یہ کام کرتا ہے، محض نقادوں کو تو وہ نصیب ہی نہیں ہوتا۔ اس ٹرانس میں جانا ان کے لیے مشکل ہوتا ہے۔ تو ان کو تخلیق کاروں کے انٹرویوز میں، ان کی گفتگوؤں میں بہت سی نئی باتیں مل جاتی ہیں جو تنقید کے لیے مشعلِ راہ ثابت ہو سکتی ہیں۔

آپ دیکھیں کتاب کا جو نام ہے، ابھی جو بات وحید احمد صاحب نے بھی اس پر کی، کہ ''لکیروں پر نہیں

جلیل عالی

چلتے"۔ محاورہ ہے "لکیر کے فقیر ہونا" یعنی بنے بنائے رستے پر چلنا، اب ہوتا یہ ہے کہ جو لوگ بنے بنائے رستے سے ہٹ کر رستہ بنانا چاہتے ہیں ان میں دو طرح کے رویے ہوتے ہیں۔ ایک رویہ وہ ہوتا ہے کہ ایسا مختلف رستہ اختیار کرنے کی کوشش کرتے ہیں جس کا کوئی تعلق پرانے رستوں سے بنتا ہی نہیں۔ تو گویا یہ ایک ایسی کوشش ہوتی ہے جس کے رائیگاں چلے جانے کا امکان غالب ہوتا ہے۔ اس لیے اس کی قارئین کے ساتھ کوئی موانست نہیں بنتی۔ جو قارئین کا پہلے تجربہ ہوتا ہے اور جو ان کا ذوق ہوتا ہے، جو کہ ایک تسلسل کے ساتھ روایت میں چلا آ رہا ہوتا ہے، اس کے ساتھ ربط رکھ کر کوئی نہ کوئی نیا رستہ بنانا پڑتا ہے۔ یہ سمجھ لیں کہ یہ بہت ہی باریک تار پر چلنے والی بات ہوتی ہے۔ اور ایسے کئی تجربے ناکام ہوئے جن میں روایت سے مکمل گریز کیا گیا تھا۔ جیسے افتخار جالب جو لسانی تشکیلات کے دعوے دار تھے ان کی شاعری کی کتاب "ماخذ" اس کی واضح مثال ہے۔ میں کبھی کبھی مذاق میں کہا کرتا ہوں کہ "ماخذ" ایسی کتاب ہے جو فرشتے سزا کے طور پر افتخار جالب کو قبر میں سنا رہے ہوں گے۔ اس کی کوئی خاص سمجھ نہیں آتی۔ جب ہم یونیورسٹی میں پڑھتے تھے ہمارا ان سے مکالمہ بھی رہا۔ ہم ان سے کہا کرتے تھے کہ اس طرح کی حرکتوں سے زبان کی نئی تشکیل نہیں ہوتی۔ بڑی تخلیقی واردات کے زور سے زبان خود بخود بدل جاتی ہے۔ غیر معمولی تخلیقی واردات اپنے انداز کا لسانی مزاج خود لے کر آتی ہے۔ جیسے اقبال کی بالِ جبریل والی شاعری ہے۔ آپ نے دیکھا بالِ جبریل کی جو زبان ہے، اس کا مزاج اپنے زمانے کی غزل سے کتنا مختلف ہے۔ مثلاً

یہ کائنات ابھی ناتمام ہے شاید
کہ آ رہی ہے دمادم صدائے کن فیکون

....

اقبال نے تو اردو زبان کو اک مردانہ اور توانا لب و لہجے سے آشنا کر دیا۔ یہ اردو پر اقبال کا بہت بڑا احسان ہے۔ عمر عزیز نے اظہار میں روایت کے شعور سے کام لیا ہے۔ اسے کہتے ہیں روایت کے تخلیقی تسلسل میں شاعری کرنا! تو یہ روایت کا تخلیقی تسلسل آسانی سے ہاتھ نہیں آتا۔ اس لیے کہ روایت کے جس تخلیقی تسلسل کی میں بات کر رہا ہوں وہ تو غالب کی دس بارہ غزلوں، میر کی پندرہ بیس غزلوں اور اقبال کی بیس تیس تخلیقات سے تشکیل پذیر ہوتا ہے۔ ہر زبان کی چوٹی کی تخلیقات روایت کی معراج بنتی ہیں۔ روایت کا جوہر ان سے تشکیل پاتا ہے۔ اس جوہر سے ہم آہنگ ہو کر جب کوئی بات کریں گے تو وہ زمینوں اور زمانوں سے آگے نکل جاتی ہے۔

اب میں ان کے موضوعات کی بات کرنا چاہتا ہوں۔ یہ بہت خاص بات ہے جو مجھے نظر آئی ان کی شاعری میں۔ ان کے موضوعات میں بڑا تنوع ہے۔ میں ہر نظم کے مندرجات پر تو بات نہیں کر سکوں گا کیونکہ لمبی بات ہو جائے گی۔ میں صرف ان کی نظموں کی کچھ اقسام کی طرف اشارے کروں گا۔

اب دیکھیں کہ جو ہر شخص کا روحانی تجربہ ایک آفاقیت رکھتا ہے۔ اس کے بارے میں احسان دانش کہتے ہیں:

جتنے اربابِ جنوں، اتنے ہی اندازِ فغاں
ایک سے ایک کی ملتی نہیں آواز کبھی

....

تو کبھی یہ تجربہ پرانا نہیں ہوتا۔ اور ہر شخص یہ سمجھتا

ہے کہ میں سب سے الگ تجربے سے گزر رہا ہوں۔ اور اس میں کوئی نہ کوئی منفرد رنگ موجود بھی ہوتا ہے۔ کہ اقبال کے لفظوں میں:

پسند اس کو تکرار کی خو نہیں
کہ تو میں نہیں اور میں تو نہیں

.....

اس لیے ایک انفرادیت تو ہوتی ہے۔ یوں ان کے اپنے منفرد تجربے کی جو نظمیں ہیں۔ ان میں ''زمستان''، ''اس نے پھول بھیجے ہیں''، ''تمھارا عشق کافی ہے''، ''مسکراؤ''، ''محبت کی باتیں''، ''مشترک''، اور ''روشنی دل'' خاص اس دائرے میں آتی ہیں۔ انہوں نے تخلیق کاروں کے ایک اور مشترک تجربے یعنی تخلیقی عمل سے گزرنے کو بڑا اچھا نام دیا ہے۔ ''محزون راحت'' عمدہ ترکیب ہے۔ اس کے لیے ہمارے پرانے لوگ ''درد بے دجہ'' کی ترکیب استعمال کیا کرتے تھے۔ جیسے کوئی مریض ڈاکٹر کے پاس جاتا ہے تو ڈاکٹر کہتا ہے تمہیں کیا ہے؟ وہ کہتا ہے بس مجھے کچھ ہوتا ہے مگر پتا نہیں چلتا کہ کیا ہوتا ہے۔ تو شاعر ادیب کو بھی ساری عمر پتا نہیں چلتا کہ جب اس پر تخلیقی بے چینی طاری ہوتی ہے تو کیوں ہوتی ہے اور اس کی نوعیت کیا ہے۔ اسی کی تلاش و تسکین کی کوشش میں وہ تخلیقی کام کرتا چلا جاتا ہے۔ ہر نئی چیز لکھتا چلا جاتا ہے۔ وہ محسوس کرتا ہے کہ وہ چیز تو میرے ہاتھ نہیں آئی۔ پھر اور لکھتا ہے۔ اور لکھتا ہے۔ اس کا یہ سفر ساری عمر جاری رہتا ہے اور حالی کے اس شعر کے مصداق یہ سفر کبھی مکمل نہیں ہوتا۔

نیا ہے لیجیے جب نام اُس کا
بہت وسعت ہے میری داستاں میں

یہ داستاں کبھی ختم نہیں ہوتی۔ عمر نے اپنے تخلیقی عمل اور وجودی کرب کے حوالے سے جو نظمیں کہی ہیں ان میں ''وگرنہ مارنا پڑتا''، ''موت کے دنوں میں لکھی نظم''، ''کیوں اذیت چنوں''، ''تو کیا برا ہے''، ''نظم سے پہلے''، اور ''زندانی'' اس حوالے سے نمائندہ نظمیں ہیں۔ پھر ظاہر ہے کہ شاعر ایک معاشرے کا باسی ہوتا ہے۔ وہ ارد گرد سے بے تعلق نہیں رہ سکتا۔ چنانچہ معاشرتی حوالوں سے، معاشی حوالوں سے، ناہمواریوں کے حوالوں سے، ظلم و ستم کے حوالوں سے ان کے ہاں جو موضوع سامنے آتے ہیں، یہ ان کی نمائندہ نظمیں ہیں۔ ''نرگس فاطمہ''، ''تھیلا آدمی''، ''نئی عورت''، ''اے میرے شہر ستم''، ''کسی کو کچھ نہیں ہوتا''، ''واجب القتل''، اور ''طفلِ خرد''۔

پھر تہذیبی پہلو آتے ہیں۔ یہ سارے انسانی وجود کے مختلف پہلو ہیں۔ میرا ایک خیال یہ بھی ہے کہ بڑی شاعری کا معیار یہ بھی ہوتا ہے کہ آپ یہ دیکھیں کہ وہ شاعر وجود کی کتنی سطحوں پر کتنی جہتوں پر زندہ ہے اور ان جہتوں میں وہ ہر جہت چاہے گہرائی میں جا رہی ہے چاہے عمودی چاہے کسی دوسری سطح پر جا رہی ہو، وہ اس میں کتنی شعریت قائم رکھتا ہے۔ بہت سارے شعرا جب کثیر الجہتی اور زیادہ وقیع موضوعات کی طرف آتے ہیں تو ان کے کلام میں شعریت کم ہو جاتی ہے۔ جیسے پروین شاکر کا ایک تجربہ آپ کے سامنے ہے کہ جب تک وہ رومانوی نظمیں لکھتی رہیں بہت جاندار لکھتی رہیں۔ لیکن جیسے ہی سماجی و سیاسی موضوعات کی طرف متوجہ ہوئیں شعریت

کا وہ معیار برقرار نہ رہ پایا۔ اس حوالے سے آپ اقبال جیسی اور غالب جیسی واردات کی قدر و قیمت کا اندازہ لگا سکتے ہیں کہ آفاقی اور کائناتی اور مابعد الطبیعیاتی مسائل کے باوجود ان کی اعلا شعریت میں کمی نہیں آئی۔ یہ شاعر کا ایک امتحان ہوتا ہے کہ وہ کتنے بڑے خیال اور موضوع کو کتنی بہتر شعریت کے ساتھ بیان کر سکتا ہے۔ عمر کے ہاں بھی وجود کی ایک سے زیادہ سطحیں زندہ و بیدار ہیں۔ اور تہذیبی پہلو سے ان کی جو نظمیں سامنے آتی ہیں ان میں ''المیہ''، ''تجزیہ کار''، ''عصرِ آخر'' اور ''کتب فروش'' شامل ہیں۔

ہم دیکھتے ہیں کہ اب کتاب حاشیے پر چلی جا رہی ہے اور سی ڈیز، انٹرنیٹ اور سافٹ ویئر سامنے آتے چلے جا رہے ہیں۔ اب کتابوں کی دکانوں میں بھی کتابیں تہہ خانوں میں چلی گئی ہیں اور سی ڈیز یا دیگر چیزیں اوپر آ گئی ہیں۔ اس حوالے سے ''دیکھنا تو پڑتا ہے''، ''کہاں جاؤں''، ''کربلا مسلسل ہے''، ''گنتی گت اور گیان''، ''حشیشی جنتوں کے پار''، ''پرکھوں کی اترن'' وغیرہ ایک اور خوبی عمر عزیز کی جو مجھے زیادہ اچھی لگی کہ وہ ہماری فکری تہذیبی روایت کی کلیت میں جینے کا جتن کرتے ہیں۔ آپ نے دیکھا کہ ہمارے ادب میں ایک بہت بڑی تحریک چلی۔ ہمارے ادب کو جتنا اس نے متاثر کیا شاید ہی کسی اور تحریک نے کیا ہو۔ اس تحریک کا نام ہے ترقی پسند تحریک۔ مگر اس میں ایک خامی رہ گئی، ایک خوانچہ رہ گیا کہ اس میں ہماری فکری تہذیبی روایت کا جو اخلاقی و روحانی پہلو تھا وہ صرف نظر ہو گیا۔ اپنی ایک منطق کے اسیر ہو کر کہ ہم تو ساری دنیا کے مزدوروں کو اکٹھا کر رہے ہیں تو ہمیں ان مابعد الطبیعیاتی اور مذہبی دائروں سے اوپر اٹھنا چاہئے، وہ یہ سمجھنے سے قاصر رہے کہ مذہب کا ایک تہذیبی دائرہ بھی ہوتا ہے اور جو تہذیبی دائرہ ہوتا ہے اس میں انسان ایک بے ساختہ انداز میں زندگی بسر کر رہے ہوتے ہیں۔ انسانی وجود کی تہذیبی سطح سے اتنا بے حد ضروری ہے۔ آپ کو پتہ ہے کہ شروع میں نعت ان کے پرچوں میں شامل نہیں ہو سکتی تھی۔ مگر ہم نے دیکھا کہ تشکیلِ پاکستان کی بہت ساری برکات میں سے ایک برکت یہ بھی ہے کہ نعت بطور صنفِ سخن ہمارے ادبی پرچوں کا حصہ بن گئی۔ اقبال کے مجموعی تجربے اور واردات میں نعت موجود تھی:

خیرہ نہ کر سکا مجھے جلوۂ دانش فرنگ
سرمہ ہے میری آنکھ کا خاک مدینہ و نجف

.....

ہر بڑی ادبی روایت کے پیچھے ایک تصورِ انسان ہوتا ہے، مثالی انسان کا تصور۔ اگر بدھ لٹریچر ہے تو اس کے پیچھے گوتم بدھ، اگر مسیحی لٹریچر ہے تو اس کے پیچھے مثالی انسان حضرت عیسیٰ کا آرکی ٹائپ ہوگا۔ مسلمانوں کی کسی بھی زبان کا ادب ہوگا تو اس کے پیچھے مثالی انسان کا جو تصور ہے اس میں رسولِ اکرم کے مثالی پیکر کے عکس جھلکتے ہیں۔ تو ظاہر ہے کوئی بھی تخلیق کار ایک مثالی تصورِ انسان کے بغیر لٹریچر تخلیق ہی نہیں کر سکتا۔ اب ہوا یہ کہ پاکستان بننے کے بعد ہم نے

دیکھا کہ کیسے خود بخود منیر نیازی کی غزلوں میں، ایسے شعر آنے لگے کہ:

فروغِ اسمِ محمدؐ ہو بستیوں میں منیر
قدیم یاد نئے مسکنوں سے پیدا ہو

بیٹھ جائیں سایۂ دامانِ احمدؐ میں منیر
اور پھر سوچیں وہ باتیں جن کو ہونا ہے ابھی

.....

یوں وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ ہمارے ادبی پرچوں کے آغاز میں پوری پوری حمدیں اور نعتیں درج ہونے لگیں۔ مجھے ایسے تخلیق کار بہت بھلے لگتے ہیں جو اپنی تہذیبی روایت کی کوئی کھڑکی اپنے اوپر بند نہیں کرتے۔ اور ایک کلی انسان کے طور پر جیتے ہیں۔ مجھے عمر کے ہاں بھی ایسی چیزیں دیکھ کر بہت اچھا لگا۔ روحانی اور مابعد الطبیعیاتی جہت سے ان کی جو نظمیں ہیں ان میں ''استفسار''، ''انکار''، ''ابابیلیں نہیں آتیں''، ''لافانیت کی موت''، ''وقت کا - گمشدہ دوراہیہ''، ''تقدیر''، ''حاضری''، (رسولؐ اللہ کے ہاں مدینہ شریف میں)۔ ''بنائے ہستی''، ''دعا''، ''دلوں کے تالے نمایاں ہیں۔''

تراجم کی بات ڈاکٹر صاحب نے کر دی۔ بہت اچھا لگا۔ ایک بات اور جو میں نے روایت کے بارے میں شروع میں کی تھی کہ روایت کے تخلیقی تسلسل میں شعر کہیں۔ اس میں یہ ہے کہ ہماری نظم یہاں سنبھل نہیں سکی۔ بہت اچھی اچھی نظمیں لکھی گئیں اور لکھ رہے ہیں لوگ۔ لیکن اب نظم کی ایک کنونشن بن گئی ہے کہ نظم مبہم ہونی چاہیے۔ ابہام ہونا چاہیے اس میں۔ ابلاغ نہیں ہونا چاہیے۔ گویا اگر نظم کی ابلاغ کی کوئی سطح موجود ہے تو یہ نظم کی خرابی ہے۔ مگر ایک نکتے سے غفلت برتنے سے یہ بات ہوئی اور وہ یہ کہ ابہام اور تہہ داری میں فرق ہے۔ ایک ابلاغ کرنے والی نظم کئی سطحیں رکھ سکتی ہے جیسے کہ میر تقی میر کہتے ہیں:

طرفیں رکھے ہے ایک سخن چار چار میر

.....

اب جو غزل کا شعر ہے۔ پڑھتے ہیں تو اس میں کئی کئی جہتیں ہوتی ہیں۔ تو نظم جو شروع سے آخر تک ایک نامیاتی وحدت ہوتی ہے، اس میں ایک سے زیادہ معنیاتی سطحیں کیوں نہیں ہو سکتیں۔ اس طرح تو آپ فیض کی کسی نظم کو خاطر میں ہی نہیں لائیں گے کہ وہ تو سمجھ آ جاتی ہے۔ لیکن وہ قاری کو کتنی تحریک دیتی ہے، یہ بھی تو یاد رکھیں۔ آپ خود فیصلہ کر لیں، کتنی دیر تک آپ لوگوں کے دلوں میں رہنا چاہتے ہیں۔ رہنا چاہتے بھی ہیں یا نہیں۔ تو ان کی نظم اس اعتبار سے ایک ذمہ دارانہ نظم ہے جو اپنے قاری کے ساتھ ایک رابطہ پیدا کرتی ہے اور قاری کی تخفیف نہیں کرتی۔ قاری کی اس وقت بھی تخفیف ہوتی ہے جب آپ بہت تشریح کے ساتھ بات کرنے لگیں گویا قاری ہر آپ کا اعتماد ہی نہیں اور اگر آپ اس میں ایسی کوئی ایمائیت ہی نہ رکھیں، تو اس کا مطلب یہ ہے کہ آپ قاری پر اعتماد نہیں کرتے۔ عمر عزیز اس خوبصورت شعری مجموعے پر ہماری حقیقی مبارک و تحسین کے حق دار ہیں۔

☆☆☆☆☆

مہناز انجم کے ''ریشمی خوابوں کی نیلی راکھ''

ادبی کائنات میں نسبتاً نئی داخل ہونے والی شاعرہ مہناز انجم سے میری کچھ زیادہ ملاقاتیں نہیں ہیں، لیکن ان کی کتاب پڑھی تو لگا کہ ان سے تو بہت زیادہ ملاقاتیں ہو چکی ہیں کہ ہر نظم ایک نئی ملاقات کا در کھولنے لگتی ہے۔ ان کی شعری وارفتگی اور ندرت اظہار کا کمال ہے کہ انہوں نے معاصر نظم کے کینوس پر اپنی تخلیقی زرخیزی کے ساتھ تیزی سے اپنی جگہ بنائی ہے ورنہ یہاں تو شعرا و شاعرات کو ایسا کرنے میں کئی کئی عشرے لگ جاتے ہیں۔ ممتاز نظم گو شاعر ڈاکٹر وحید احمد بجا طور پر کہتے ہیں کہ ان کی تمثال دار نظمیں قاری کو اس لیے گرفت میں رکھتی ہیں کہ وہ روحِ عصر میں گندھی ہوئی ہیں، اور جناب افتخار بخاری کی اس رائے سے بھی اختلاف نہیں کیا جا سکتا کہ مہناز انجم کے مصرعے پرندوں کی طرح گنگناتے ہیں اور الفاظ پھولوں کی طرح خوشبو دیتے ہیں۔ ان کی ایک اور تخلیقی نسبت یہ بھی ہے کہ معروف نظم گو شاعر علی محمد فرشی ان کے برادر نسبتی ہیں، مگر یہ بھی سچ ہے کہ کوئی بھی نسبت کسی انسان کو تخلیق کار نہیں بنا سکتی جب تک تخلیق کا اُکھوا اُس کے اندر سے نہ پھوٹے۔ یار عزیز علی محمد فرشی کی نظمیں بھی نظر سے گزرتی رہتی ہیں اور اب مہناز انجم کی نظمیں پڑھ کر یہ ضرور کہنا چاہتا ہوں کہ ان کا شعری خطہ یکسر الگ اپنے رنگوں کی نیرنگیاں دکھا رہا ہے۔

ان آزاد نظموں کی مترنم بحریں دلآویز ہیں جن کی دلکشی موضوع کے کھردرے پن اور باغیانہ پن کو ایک نیم شفاف پردے میں چھپا کر سچائی کو اپنے پورے حسن کے ساتھ اجاگر کرنے لگتی ہے۔ مہناز انجم کا کمال یہی ہے کہ وہ اپنے لہجے کی نرماہٹ کی کوملتا کے اندر حقیقت کی کڑواہٹ کو بظاہر چھپائے ہوئے مگر اہلِ نظر کے لیے عیاں کیے ہوئے ہے۔ ان نظموں میں ایک ایسی نغمگی ہے جو غزل کے سریلے پن اور موسقیت کے قائل قاری کا دل بھی لبھاتی ہیں اور اسے احساس دلاتی ہیں کہ اصل نغمگی غزل، پابند نظم، آزاد نظم یا نثری نظم میں نہیں ہوتی، بلکہ اس کا اوّلیں ماخذ و منبع تخلیق کار کا خیال ہوتا ہے، اب یہ قاری کا ابلاغی مسئلہ جانیے کہ اس نے کچھ عروضی اوزان و بحور میں تو یہ نغمگی اور ردھم دریافت کر لی مگر اس کائنات کی بہت سی نغمگی اور ردھم ابھی نادریافت ہے، اور اس صورتِ حال کا شکار آزاد نظم اور نثری نظم خاص طور پر ہیں جبکہ آزاد نظم کسی حد تک پابند قافیوں اور برابر کے مصرعوں کی بدولت قاری کی غنائیت اور نغمگی کے ذوق کی گرفت میں آ جاتی ہے۔ مہناز انجم کی تمام نظمیں آزاد نظمیں ہیں، نثری نہیں، ان کی نظموں میں میٹر اور بحر کا تسلسل کہیں بھی توڑ پھوڑ کا شکار ہوتے محسوس نہیں ہوتا، کہیں بھی جھٹکا نہیں لگتا۔

ان کی نظموں میں ایک واضح رجحان ''میل شاونزم'' کے خلاف احتجاج اور نسائیت کی

نسیم سحر

بھرپور نمائندگی کا ملتا ہے، اور ان کی یہی شعری جہت ان کے حرفِ آغاز میں یوں بیان ہوئی ہے کہ "میں نے پہلی نظم کب کہنے کی کوشش کی؟ شاید تب جب مجھے پہلی بار ایک لڑکی ہونے کی وجہ سے عدم تحفظ کا احساس دلایا گیا"۔ اس حوالے سے ان کی ایک نمائندہ نظم "اگلے جنم موہے بٹیا نہ کیجیو" ہے جس میں واضح طور پر ماں بھی بیٹے سے محبت کرتی اور بیٹی کو نظرانداز کرتی ہے۔ لیکن ان کی ایک نظم "زمیں کی نائب" ایک بلند آہنگ احتجاجی صدا ہے، چند مصرعوں میں مہناز انجم صدائے احتجاج کے ساتھ ساتھ جو بہت اہم سوال اٹھاتی ہیں وہ بھی ملاحظہ ہو:

جو انساں زمیں پر ہے / نائب خدا کا / تو
کیا اس نیابت میں / عورت کا حصہ بھی ہے
کچھ ذرا سا / یا پھر آدمی، شخص،
انساں / فقط ہیں / مذکر کے صیغے /
ذرا اپنے لغات لاؤ / مجھے بھی بتاؤ!

لیکن مہناز انجم کی شاعری محض اس موضوع تک محدود نہیں ہے، وہ بہت سے دیگر سماجی، معاشرتی، سیاسی، رومانی اور انسانی اہمیت کے انفرادی و اجتماعی موضوعات پر بھی نظمیں کہتی ہیں جو ان کی وسعتِ مطالعہ کی دلالت بھی کرتا ہے اور تخلیقی اپج کی بھی۔ ان کی پوری کتاب پڑھنے کے بعد کتاب کے عنوان "ریشمی خوابوں کی نیلی راکھ" کی معنویت بھی پوری طرح آشکار ہو جاتی ہے، اور ریشمی خواب نیلی راکھ میں کیسے بدلنے لگتے ہیں یہ اُن کی ہر نظم زبانِ حال سے بتاتی جاتی ہے۔

ان کی نظموں میں الفاظ کے شکوہ کے ساتھ ساتھ کچھ ایسے لفظ بھی ہیں جو شعری مزاج سے مطابقت نہ رکھنے یا نامانوس ہونے کے باوجود عمدگی سے استعمال کیے جانے کے باعث قاری بآسانی قبول کر لیتا ہے مثلاً لارے لپّے، تروپے، اسی طرح ان کے برتے ہوئے کچھ نئے مفرد و مرکب الفاظ اور لفظی تراکیب کی بھی داد دینی پڑتی ہے: خوابچوں، خوش رِغنا، اوچ پانی، خوف کا چرمی کوڑا، لفظوں کا بھوجن، پرکاہِ ماندہ۔ یہ چند لفظ محض مثال کے طور پر ہیں ورنہ سبھی نظموں میں یہی وصف نمایاں ہے۔

اپنے جریدے "تسطیر" کے ایک شمارے میں اس کے مدیرِ اعلیٰ اور معروف نظم گو شاعر نصیر احمد ناصر آزاد نظم کے آغاز اور ارتقائی مراحل کا ذکر کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ تیسری لہر کے نظم نگار اردو نظم کی روایت سے بھی وابستہ و آگاہ ہیں اور اپنے پیش روؤں میرا جی، ن م راشد، فیض، مجید امجد وغیرہ سے جداگانہ اسلوب، لفظیات اور حسیات بھی رکھتے ہیں اور ان کی زبان بھی جدید ہوتی ہے۔ میں نے یہ کتاب پڑھ کر یہی محسوس کیا ہے کہ مہناز انجم اسی تیسری لہر کی نمایاں نظم نگار شاعرہ ہیں، جو آزاد نظم میں اپنی ایک انفرادی پہچان کروانے میں کامیاب رہی ہیں۔ چنانچہ شعری کائنات میں ان کا استقبال بھی اہلِ علم و ادب نے کھلے دل سے کیا ہے۔

اس مختصر اظہاریے کو تمام کرتے ہوئے میں ممتاز نقاد سلیم احمد (مرحوم) کا وہ جملہ دہرانا چاہتا ہوں جو کسی زمانے میں ادبی حلقوں میں بڑا زیرِ بحث رہا تھا کہ نئی نظم کو پورا آدمی چاہیے۔ اب یہ تو علم نہیں کہ انہیں نئی نظم میں پورا آدمی ملا تھا یا نہیں، لیکن مہناز انجم کی نظمیں پڑھنے کے بعد میں پورے وثوق اور یقین سے کہہ سکتا ہوں کہ نئی نظم کو پوری عورت مل گئی ہے۔ وما علینا الا البلاغ۔

☆☆☆☆☆

فنِ تقریر: چند مشورے

تقریر کا فن کب ابتدا ہُوا، کچھ کہنا محال ہے لیکن اِس کے اوّلین برتنے والوں میں اہلِ یونان کا نام آتا ہے جن کے تین عظیم مقررین یعنی سقراط، افلاطون اور ارسطو کو دُنیا جانتی ہے۔ یونان کے بعد اہلِ روم میں اِس فن کے بڑے نام پائے جاتے ہیں جیسے سسرو Cicero اور جولیس سیزر وغیرہ۔ عرب مقررین میں امراؤ القیس جیسا فصیح البیان کوئی نہیں گزرا۔ برِصغیر میں کانگریس اور مسلم لیگ کی تحریکات نے نہایت عمدہ مقرر پیدا کیے جن میں سرسید احمد خان کے بعد مولانا ظفر علی خاں، مولانا ابوالکلام آزاد وغیرہ کے نام درخشاں ستاروں کی طرح روشن ہیں۔

حیوانِ ناطق ہونے کے حوالے سے انسان دُوسری مخلوقات پر فوقیت رکھتا ہے۔ انسانی تاریخ و تمدن کی ترویج میں جہاں دُوسرے شعبوں سے تعلق رکھنے والے افراد نے اپنا حصہ ڈالا وہاں فنِ تقریر سے متصف اشخاص نے بھی مثبت اثرات مرتب کیے ہیں۔ جذبات و احساسات کو جس طرح تقریر متاثر کرتی ہے وہ تحریر سے ممکن نہیں۔ فنِ تقریر کی صلاحیت جس سرعت سے ایک شخص کو معاشرے میں اہمیت دلا سکتی ہے کوئی دُوسری معاشرتی سرگرمی ویسی ناموری کا موجب نہیں ہو سکتی۔

سامعین کو اپنے خیالات کی پیروی پر اُکسانا مقرر کی دلی مسرت کا سبب ہوتا ہے۔ وہ شخص محفل میں بازی لے جاتا ہے جو اپنے خیالات کو خوبی، سلیقے اور ترتیب سے بیان کرنے کی صلاحیت رکھتا ہو۔ مقرر کا تصنع سے پاک ہونا اور اپنے موضوع پر متواتر سوچتے رہنا اور اُسے پوری طرح محسوس کرنا ہی کامیاب تقریر کی ضمانت ہو سکتا ہے۔ موضوع پر میسر مواد کا انتخاب اور ترتیب

خاور اعجاز

نہایت اہمیت کے حامل عناصر ہیں۔ اپنے موضوع پر زیادہ سے زیادہ مواد اور اطلاعات مہیا کریں، پھر اُن میں سے بہترین مواد کا انتخاب کر کے بقیہ کو نظر انداز کر دیں۔ موضوع پر جمع کردہ تمام مواد قابلِ استعمال نہیں ہو سکتا اس لیے نا قابلِ استعمال مواد نکال دینے سے تقریر کا وزن بڑھتا ہے اور تقریر کے کامل ہونے کا اعتبار بھی حاصل ہوتا ہے۔

اپنے احباب سے موضوع پر گفتگو کریں اور اُن کے مشوروں کو مدِ نظر رکھیں۔ دُوسروں کی مثالیں بھی دیں لیکن اپنے مشاہدات اور تجربات کو فوقیت دیں؛ انفرادیت قائم رکھنے کے لیے ذاتی حوالے زیادہ کارآمد ثابت ہوتے ہیں۔ مستعار مواد سے پرہیز کریں اور اپنے ذہن کی پیداوار پر انحصار کریں کیونکہ دُوسروں سے لیے گئے خیالات کا اظہار کرنے میں وہ ولولہ انگیزی مفقود ہو گی جو اپنے ذاتی خیالات پیش کرنے میں دکھائی دے سکتی ہے۔ موضوع کے بارے میں تسلی بخش علم رکھیں، ایسی باتوں کا علم جن سے لوگ متاثر ہُوئے بغیر نہ رہ سکیں۔ کوئی متعلقہ بات اَن کہی نہ رہنے دیں۔ تقریر کے دوران موضوع کے مختلف رُخ ایک ایک کر کے زیرِ بحث لائیں اور اُنھیں حتی الوسع پھیلا کر بیان کرنے کی کوشش کریں۔

کسی موضوع کے فنی پہلوؤں کے تذکرہ سے تقریر کے بے کیف ہونے کا خدشہ ہوتا ہے لہٰذا بہتر ہو گا کہ اِس کے بجائے اپنی تقریر کو دلچسپ مگر متعلقہ مواد سے مزین کریں۔ تبلیغی قسم کے فقروں سے پرہیز کریں اور موضوع سے متعلق بنیادی حقائق پر توجہ مرکوز رکھیں۔ مبہم خیالات سے خود کو بچائیں اور چاشنی برقرار رکھنے کے لیے گفتگو میں روانی پیدا کریں۔ اپنی پسند کے بجائے سامعین کی دلچسپی کا خیال رکھیں کہ اُن کی خواہشات اور رجحانات پر بات چیت آپ کو آدھا میدان فتح کرا دے گی۔

جس طرح نقشے کے بغیر مکان کی تعمیر لاحاصل ہو گی اُسی طرح خاکے کے بنا تقریر بے سود رہے گی لہٰذا خاکہ ضرور تیار کر لینا چاہیے کیونکہ کوئی ایسی بات کامیابی سے ہمکنار نہیں ہو سکتی جسے پہلے سے سوچ کر مربوط نہ کر لیا گیا ہو۔ اپنی تقریر کو حقائق اور اُن حقائق کے بارے میں دلائل سے بہتر بنائیں۔ کوئی غلط یا غیر عقلی بات شاملِ گفتگو نہ کریں اور مفروضات سے پرہیز کریں۔ تقریر کو ہموار اور معتبر بنانے کی خاطر اُسے بار بار چھان پھٹک کے عمل سے

گزاریں حتیٰ کہ اِس میں مزید تبدیلی کی گنجائش محسوس نہ ہو۔

آپ کا اسلوبِ بیان نکھرا ہُوا ہونا چاہیے۔ تقریر میں الفاظ اور مواد کے علاوہ یہی وہ عنصر ہے جو سب سے اہم ہے - اچھا اسلوب تقریر کے کمتر مواد کو بھی خوشگوار بنا دیتا ہے۔ تقریر کو خود کلامی کی طرح ادا نہ کریں، یہ عمل دُوسروں تک آپ کی بات پہنچانے سے قاصر رہے گا، کامیاب مقرر وہی ہے جو اپنے دل و دماغ کی بات سامعین کے دل و دماغ میں اُتار سکے ورنہ آپ کی باتیں صدا بہ صحرا ثابت ہوں گی اور لگے گا کہ آپ انسانوں سے نہیں پتھروں سے مخاطب ہیں۔ مقرر کا سامعین سے یوں مخاطب ہونا جیسے وہ انھی میں سے ہے بہت کارآمد ثابت ہوتا ہے، اِس کے لیے یہ فرض کر لینا چاہیے کہ آپ لوگوں سے باتیں کر رہے ہیں اور اُن باتوں میں آپ کا دھڑکتا ہُوا دل شامل ہے۔ یہی وہ فطری انداز ہے جسے سامعین پسند کرتے ہیں۔ کرخت اور غیر فطری اندازِ بیان سامعین کو بور کرے گا۔ اہم الفاظ پر زور دیں اور لہجے کے زیر و بم کا خیال رکھیں نیز تقریر کے دوران الفاظ کی مناسبت سے لہجہ بدلتے رہیں۔ کہیں کہیں خاموشی اور مختصر وقفے تقریر کی لذت کو بڑھاتے ہیں اور مفید ثابت ہوتے ہیں۔ مشکل اور گنجلک اصطلاحات سے گریز کریں اور تقریر کے ہر پہلو کو سہل انداز میں اس طرح واضح کریں کہ وہ سب کی سمجھ میں آجائے۔ اہم خیالات کو الفظ بدل بدل کر دہرائیں، یہ تکرار آپ کے خیالات سامعین کے ذہن پر نقش کرنے میں معاون ثابت ہو گی۔ گلشنِ فکر سے سرسبز، خوشبودار اور مہکتے ہُوئے پھولوں کی طرح کِھلے ہُوئے الفاظ کا چناؤ تقریر کی لذت بڑھانے میں معاون ثابت ہوتا ہے۔ مختلف اوقات میں اپنے موضوع پر غور کریں تا کہ خیالات زیادہ استوار اور گہرائی کے حامل اور آپ کی اپنی لکسال کے سکے نظر آئیں۔ ایک عمدہ مقرر کے اوصاف میں سریع الفہمی، روانی، کامن سینس (کیا کہنا ہے اور کیا نہیں؛ کون سے خیالات اور الفاظ مناسب ہیں کون سے نہیں)، ترتیب، استدلال، منطقی بیان، برجستگی، قادر الکلامی، قوتِ اظہار، اختصار پسندی، وسعتِ مطالعہ اور خود اعتمادی بہت ضروری عناصر ہیں۔ سسرو کا قول ہے کہ فلسفی کی سی دانائی، شاعر کی سی زبان، قانون دان جیسا حافظہ اور اداکار کی سی فصاحت مل کر ایک اچھا مقرر بنتا ہے۔

☆☆☆☆☆

روکتے روکتے بھی آنکھ چھلک پڑتی ہے..... یادیں خالد علیم کی

اِدھر ہم کئی روز سے برفانی طوفان کی زد میں ہیں؛ دن رات برف پڑ رہی ہے۔ گویا باہر ہر شے منجمد ہے--- مگر اندر کوئی اور ہی طوفان بپا ہے؛ یادوں کا طوفان جس کی لہریں بیتے سمے کے عکس اپنے دامن میں سمیٹے وقت کے در و دیوار سے ٹکرا رہی ہیں۔ کیسے کیسے مہربان چہرے اور کیسے کیسے دل نشیں لہجے پوری آب و تاب کے ساتھ ابھرتے ہیں اور آہستہ آہستہ غائب ہو جاتے ہیں! خالد احمد صاحب کی رحلت کے بعد مجھے دوسرا بڑا صدمہ اب لگا ہے جب ہم دم دیرینہ جناب خالد علیم کے انتقال کی اطلاع موصول ہوئی۔ حواس کو مجتمع کر کے چند یادیں یا یوں کہیے کہ یادوں کی جھلکیاں بہ مشکل ورق پر اتاری ہیں جو ایک مضمون کی صورت 'بیاض' کے لیے بھیج رہا ہوں۔

یہ نصف صدی کا قصہ ہے، دو چار برس کی بات نہیں۔

پچاس سال کی دوستی کے چند ایک منتخب واقعات کی تفصیل بھی لکھی جائے تو کم از کم ایک کتاب تو بن ہی جائے گی۔ سو، مضمون کو یادوں کی ٹکڑیوں کی صورت لکھ دیا ہے کہ ان کی شخصیت و فن کے مختلف پہلوؤں کا کسی نہ کسی حد تک ذکر تو ہو جائے۔

سوموار۔ ۱۰ فروری کی صبح ۔ دیوار پر آویزاں کلاک کی سوئیاں نو بجے کا وقت دکھا رہی ہیں۔ ہمارے قصبہ واٹر ڈاؤن میں رات سے شدید برف باری ہو رہی ہے۔ باہر سخت سردی ہے اور اندر ایک عجیب اور ناقابلِ بیاں بے چینی کی کیفیت۔

خدا خدا کر کے صبح ہوئی ہے مگر وہی گدلی گدلی سی۔ دھوپ کی حدت افروز کرنوں سے محروم صبح۔ گویا اندر باہر ایک اُداسی کا سماں ہے۔

میں ایک نظر باہر بالکونی میں جھانکتا ہوں۔ ریلنگ کے ساتھ لٹکے رابعہ بیٹی کے رنگ دار آرائشی گملوں میں بھی برف ہی کے پھول کھلے دکھائی دیتے ہیں۔ طاہرہ چائے کا کپ میز پر رکھتی ہے۔ میری نظر کمرے کی طرف لوٹ آتی ہے اور اُسی وقت ''ٹن، ٹن، ٹن'' واٹس ایپ پر نئے پیغام کی اطلاعی گھنٹی بج اٹھتی ہے۔ میں اپنا فون اٹھاتا ہوں۔ سکرین پر ابھرے پیغام کو دیکھتا ہوں اور ایک ہاتھ سائیڈ پر رکھتے ہوئے صوفے پر بیٹھ جاتا ہوں:

''خالد علیم صاحب۔ اناللہ وانا الیہ راجعون''۔

واٹس ایپ پر اُبھرا نوید صادق صاحب کا یہ یک سطری پیغام سامنے ہے۔ آنکھیں پیغام کے الفاظ میں اُلجھی ہیں اور دل ہے کہ بیٹھا جا رہا ہے۔ دل کا حزن و اضطراب اَب سینے میں دھڑکنوں کی بے ترتیبی سے نمایاں ہے۔

اِس سیدھے سادے جملہ میں چھپے درد کی روشنی نے یک دم زندگی کے کتنے ہی ٹیڑھے میڑھے ٹیڑھے راستوں کو یادوں کی طرح روشن کر دیا ہے اور ذہن کے پردے پر ایک منظر ابھر رہا ہے اور ایک منظر غروب ہو رہا ہے اور اب تو دو، تین، چار مناظر ایک ساتھ اُبھر آئے ہیں؛ ایک دوسرے میں مدغم، تہ بہ تہ، کچھ مبہم، کچھ واضح، کچھ دھندلے۔

دھند منظر پر چھائی ہے یا میری بھیگی پلکوں پر؟ فیصلہ کرنا مشکل ہے۔ خالد علیم صاحب ہی کا تو مصرعہ ہے یہ:

روکتے روکتے بھی آنکھ چھلک پڑتی ہے

چھلکتی آنکھ کی یہ دھند رفتہ رفتہ چھٹنے لگتی ہے اور وقت کی تہہ میں سے بے ترتیب یادیں نمایاں ہونے لگتی ہیں۔ روشن روشن دنوں اور نیم روشن شاموں کی یادیں، بیتے پچاس برس کی پرنور دھول سے اَٹے راستے پر اُبھرتی سائیکل کے پہیوں کی آواز میرے تصور کو کینیڈا کے برف زار سے اُڑا کر گوجرانوالہ کی اُس گنجھی نامعلوم سڑک پر لے جاتی ہے جو میونسپل لائبریری سے ایک بڑے سرکاری افسر کے بنگلہ کی طرف جاتی ہے۔ جہاں عشائیہ کے بعد ایک اور مشاعرہ کا اہتمام ہے۔

۱۹۷۶ کے موسمِ گرما کی ایک شام ۔

کمیونٹی ہائی سکول مزنگ لاہور میں اپنے اردو کے استاد جناب راز کاشمیری کی دعوت پر میں والد صاحب کے ساتھ گوجرانوالہ میں ایک مشاعرہ پڑھنے آیا ہوں۔ مشاعرہ کے صدر

محترم احسان دانش صاحب ہیں۔اس میں لاہور سے جو شعرا شریک ہیں ان میں نوجوان شاعر جناب خالد علیم بھی ہیں۔ دبلے پتلے، لمبا قد، ستواں ناک پر ٹکی نظر کی عینک اور آنکھوں سے جھلکتی ذہانت اور چہرے پر دمکتی متانت۔ خالد علیم اپنے والد محترم علیم ناصری صاحب کے ساتھ آئے ہیں۔ میں انھیں اس سے قبل اُردو بازار لاہور میں واقع کامیاب بک ڈپو میں منعقدہ ماہانہ نعتیہ مشاعرہ میں دیکھ اور سُن چکا ہوں۔ مگر ذاتی تعارف کی اب تک صورت نہیں بنی۔ میں بھی طبعاً کچھ کم گو، کم آمیز یعنی شرمیلا واقع ہوا ہوں۔ میونسپل لائبریری میں مشاعرہ کے بعد راز صاحب نے محمد احمد شاد صاحب اور زبیر نازش صاحب کو خالد علیم صاحب اور مجھے دوسری شعری نشست میں لانے کی ذمہ داری سونپتے ہیں۔ ہمارے دونوں میزبان شاعر اپنے اپنے سائیکل سنبھالتے ہیں اور ہمیں سائیکل سواری کی دعوت دیتے ہیں۔ میں انھیں مشورہ دیتا ہوں کہ کیوں نہ ایک سائیکل گوجرانوالہ والے شاعر لے لیں اور ایک لاہور والے؟ میزبانوں کو یہ تجویز اچھی لگتی ہے اور خالد صاحب اور میں ایک سائیکل پر سوار ہو جاتے ہیں۔ یہ کوئی آدھ پون گھنٹے کا سفر ہے۔ ہم دونوں کو ذاتی تعارف کا موقع مل جاتا ہے۔ خالد صاحب مجھے بتاتے ہیں کہ وہ میٹرک کے بعد سے پنجاب کے محکمۂ صحت کے تحت گلبرگ میں قائم گورنمنٹ میڈیکل سٹورز ڈپو میں ٹائپسٹ کے طور پر ملازم ہیں۔ ان کے والد گرامی علیم صاحب بھی وہیں کام کرتے ہیں۔ وہ یہ بھی بتاتے ہیں کہ ان کا ایک شعری مجموعہ ''فغانِ دل'' بھی شائع ہو چکا ہے جو ان کی ابتدائی شاعری پر مشتمل ہے۔ ان کے مطابق اُردو کے شعرا میں انھیں علامہ اقبال کا کلام بے حد پسند ہے۔ یہی باتیں کرتے ہم مشاعرہ گاہ پہنچ جاتے ہیں۔

ہماری اگلی ملاقات لاہور میں ہوتی ہے جو پرتکلف رسمی ملاقاتوں اور باتوں سے ہوتی ہوئی ہمیں قدرے بے تکلف دوستی کے موڑ تک لے آتی ہے۔ سکول سے چھٹی ہوتی ہے۔ میں گیٹ سے باہر نکلتا ہوں تو سامنے خالد صاحب کھڑے دکھائی دیتے ہیں اپنے سائیکل کے ساتھ۔ ہم دونوں باتیں کرتے گھر پہنچتے ہیں۔ میں اندر جا کر امی جان کو بتاتا ہوں اور خالد صاحب کو اندر آنے کی دعوت دیتا ہوں۔ یہ جان کر کہ خالد صاحب بچپن ہی میں والدہ کی محبت اور شفقت سے محروم ہو گئے تھے امی جان انھیں فوراً اپنا بیٹا بنا لیتی ہیں۔ کھانا کھا کر ہم ''لاہور گردی'' کے سفر پر روانہ ہو جاتے ہیں۔ مزنگ سے نکلتے ہیں تو لارنس گارڈن جا بیٹھتے ہیں، چوک ریگل سے سموسے کھاتے ہیں، انارکلی میں واقع پرانی کتابوں کی دکانیں کھنگالتے ہیں، لاہور ہوٹل چوک کے پاس واقع 'سٹوڈنٹس اون چوائس' نامی ریستوران

میں چائے پیتے ہیں، حلقۂ تصنیفِ ادب کے تنقیدی اجلاسوں، مجلسِ اردو، مجلسِ شمعِ ادب اور ادارۂ ادب (ماڈل ٹاؤن) کے مشاعروں میں شرکت کرتے ہیں اور خوب باتیں کرتے ہیں۔ ہنستے ہیں، گنگناتے ہیں۔ کبھی کبھی مل کر 'فلم بینی' بھی کر لیتے ہیں۔ خالد صاحب کو ندیم کی اداکاری پسند ہے۔ وہ اس کی نئی کیا پرانی فلمیں بھی دیکھتے ہیں اور مجھے بھی دکھاتے ہیں۔

ہم چند دوستوں نے مل کر ایک ادبی تنظیم ''انجمنِ فکرِ ادب'' بنا رکھی ہے۔ اس کے پہلے مشاعرہ کی دعوت دینے میں اور افضل اقبال خالد صاحب کے گھر نصیر آباد یا نفیر آباد جاتے ہیں تو وہاں کمروں کی دیواروں کو ترتیب سے رکھی کتابوں سے بھرا پاتے ہیں۔ محسوس ہوتا ہے گویا کسی بہت عمدہ لائبریری میں آ گئے ہیں۔ وقت گزرنے کا پتہ ہی نہ چلتا۔ علیم ناصری صاحب سے بھی ملاقات ہوتی ہے۔ خالد علیم صاحب کتابوں کے حصول اور ان کی اہمیت سے متعلق واقعات بھی سناتے جاتے ہیں اور چائے بھی پلاتے جاتے ہیں۔ انھی کے مشورہ پر انجمنِ فکرِ ادب کا نام بدل کر 'دبستانِ اہلِ قلم' کر دیتے ہیں۔ میں اور میرے دوست افضل اقبال (حنیف) اور بابر شوکت ابھی زیرِ تعلیم ہیں اور ظاہر ہے زیادہ وسائل نہ رکھتے۔ تو ایسے میں خالد علیم صاحب ہی مشاعرہ کے اخراجات کا بڑا حصہ برداشت کرنے کا اعلان کرتے ہیں۔ میں کہتا ہوں: ''خالد صاحب ہمارا آئی۔ ایم۔ ایف ہیں۔''
سب کھلکھلا اٹھتے ہیں۔

کتاب سے محبت کا جذبہ انھیں یقیناً علیم ناصری صاحب سے ملا ہے۔ اپنے والد کی طرح خالد صاحب بھی اہم اور نایاب کتب کی تلاش میں رہتے ہیں اور انھیں مہنگے داموں بھی خرید کر لیتے ہیں۔ اس سلسلہ میں باقاعدگی سے بک سٹورز کے چکر لگاتے ہیں۔ آج لوہاری گیٹ کا سامنے واقع حامد حسن حامد صاحب کی کتابوں کی دکان پر پہنچے ہیں۔ وہاں پروفیسر خالد بزمی صاحب پہلے سے موجود ہیں۔ خالد صاحب کو کتابیں خریدتے ہوئے دیکھ کر پروفیسر صاحب از راہِ تفنن کہتے ہیں:
''دیکھو، خالد علیم! کتابیں جمع کرنے کا شوق تو بہت اچھا ہے۔ مگر اس میں دکھ کا پہلو یہ ہے کہ کبھی نہ کبھی انھیں گھر سے نکالنا پڑ جاتا ہے۔ سو، کتابیں اس حد تک ہی جمع کرو کہ بیگم ناراض نہ ہو۔''
خالد علیم صاحب جواباً کہتے ہیں: ''لیکن میری تو ابھی شادی ہی نہیں ہوئی۔ مجھے کیا فکر؟''
پروفیسر صاحب مسکرا کر کہتے ہیں: ''اور جب شادی ہو جائے گی تب۔۔۔؟''
خالد صاحب کا بے ساختہ جواب: ''اگر بیگم نے کتابیں رکھنے پر اعتراض کیا تو میں کتابیں

رکھلوں گا اور بیگم کو اس کے میکے بھیج دوں گا۔'' اس پر ایک قہقہہ بلند ہوتا ہے اور پروفیسر صاحب کہتے ہیں کہ اچھا برخوردار، وقت آنے پر یہ بھی پتہ چل جائے گا۔

ہم چوک ریگل کے پاس شیری کے چائے خانہ میں ہیں۔ خالد علیم صاحب علامہ اقبال کے کلام کی باریکیاں اور اس کا حسن ہم پر واضح کر رہے ہیں۔ وہ اقبال کی نظم مسجدِ قرطبہ کے بند کچھ ایسے خاص اور موثر انداز میں پڑھتے ہیں کہ مجھے محسوس ہوتا ہے گویا کوئی کارواں اپنی منزل کی جانب رواں دواں ہے۔ یہ ایک عجیب احساس ہے۔ خالد صاحب میرے واحد قریبی شاعر دوست ہیں جنھیں رباعی کی صنف سے بے حد محبت ہے۔ والد صاحب قبلہ یزدانی جالندھری صاحب بھی چوں کہ رباعی سے شغف رکھتے ہیں اور ان کا پہلا شعری مجموعہ 'ساغرِ انقلاب'' رباعیات پر ہی مشتمل تھا۔ خالد صاحب مجھ سے ملنے آتے ہیں۔ اس وقت والد صاحب بھی گھر پر ہیں۔ دونوں رباعی پر خوب گفتگو کرتے ہیں۔ میں تو بس چائے پلانے پر مامور ہوں۔ والد صاحب جہاں علیم ناصری صاحب کے علم و فضل کے معترف ہیں وہاں خالد علیم صاحب کے ذوق سلیم سے بھی بہت متاثر دکھائی دیتے ہیں۔ خالد صاحب کے شعری ذوق کے تو متعدد اساتذۂ فن قائل ہیں مگر ان میں نمایاں عبدالعزیز خالد صاحب، حفیظ تائب صاحب، خالد بزمی صاحب، جعفر بلوچ صاحب، خالد شفیق صاحب اور صوفی محمد افضل فقیر صاحب ہیں۔

لاہور کی ادبی دنیا میں خالد علیم صاحب کے ہم نام ایک نام ور شاعر جناب خالد احمد ہیں۔ جن کا شمار صاحبِ اسلوب شعرا میں ہوتا ہے۔ میری ان سے ملاقات ہوتی ہے۔ وہ مجھے بہت متاثر کرتے ہیں۔ میں خالد علیم صاحب کو بھی ان سے ملوانے لے جاتا ہوں۔ وہ بتاتے ہیں کہ وہ علیم ناصری صاحب کے پرانے دوست ہیں۔ خالد احمد صاحب ملاقات پر اپنے مخصوص انداز میں طنز و مزاح کے پھول برساتے رہتے ہیں جنھیں ہم ہنستے ہنستے جمع کرتے رہتے ہیں اور بعد ازاں اداس لمحوں میں انھیں یاد کر کے مسکرایا کرتے ہیں۔ خالد احمد صاحب بھی خالد علیم صاحب کے گہرے مطالعہ اور ذوقِ شعر کی پزیرائی کرتے ہیں۔ وہ خالد بزمی صاحب اور علیم ناصری صاحب کے ساتھ بھی اپنی بے تکلفی کے قصے سناتے ہیں اور قدیر شیدائی صاحب کے ''دفترِ فانوس'' میں اپنی ملاقاتوں اور خوش گپیوں کا تذکرہ مزے لے لے کر تے ہیں۔

خالد احمد صاحب اور خالد علیم صاحب میں ذوقِ شعری کے علاوہ بھی کئی ''اقدار'' مشترک ہیں۔ مثلاً چائے اور سگریٹ نوشی۔ اِن دو 'مضامین' میں میرے والد

یزدانی صاحب بھی ان دونوں کے 'ہم جماعت' ہیں۔ چائے کا کپ سامنے آتے ہی ہاتھ سگریٹ کی ڈبیا کی جانب بڑھ جاتا ہے اور سگریٹ کا آخری کش لیتے ہی پھر سے چائے کی طلب کا اعلان ہوجاتا ہے۔

خالد احمد صاحب کے حوالہ سے تو مجھے معلوم نہیں مگر ہمارے خالد علیم صاحب ایک سے زیادہ بار چائے اور سگریٹ کو خیر باد کہنے کا عزم کر چکے ہیں جو ایک بار بھی زیادہ دیر پا ثابت نہیں ہوا۔ آج خالد علیم صاحب کہہ رہے ہیں:

''کل ایک حاذق حکیم صاحب سے ملاقات ہوئی۔ انھوں نے چائے اور سگریٹ فی الفور ترک کرنے کا مشورہ دیا ہے۔''

''چلیے، ٹھیک ہے۔ اچھی بات ہے۔'' میں کچھ سوچتے ہوئے کہتا ہوں۔ ''تو ان کی جگہ کیا تجویز کیا ہے حکیم حاذق نے؟''

''دودھ اور دہی۔۔۔ لسی بھی اس میں شامل ہے۔'' جواباً کہتے ہیں۔

لیجیے، آج پہلے ہی روز گوالمنڈی کی دودھ دہی کی ایک دکان سے پیالہ بھر دہی کھایا گیا ہے۔ انجینئرنگ یونی ورسٹی گراؤنڈ میں ہاکی کی پریکٹس کی گئی ہے۔ دوسرے روز پیالہ بھر گرم گرم دودھ نوشِ جاں کیا گیا ہے اور ہاکی کی پریکٹس کی گئی ہے، تیسرے روز لسی کے بڑے بڑے گلاس گلے سے اتارے گئے ہیں اور ۔۔۔ اور چوتھے روز دودھ دہی کی دکان سے نظر چُراتے ہوئے ذرا آگے بائیں جانب مُڑتے ہوئے سیدھا 'سٹوڈنٹس اون چوائس' ریستوران میں۔۔۔ کڑک چائے کا آرڈر دیا جارہا ہے۔

چائے سامنے آتی ہے تو جانے کہاں سے ان کی انگلیوں میں ایک سگریٹ بھی مسکرانے لگتا ہے۔ میں یہ سب دل چسپی سے دیکھ رہا ہوں۔ مجھے اپنی طرف متوجہ پاکر اور معنی خیز انداز میں مسکراتے دیکھ کر ایک چُسکی چائے کی لیتے ہیں اور ایک لمبا سا کش سگریٹ کا۔ اور پھر دھوئیں کو دیکھتے ہوئے ایک قہقہہ بلند کرتے ہیں۔ کہتے کچھ نہیں۔ گویا ان کا قہقہہ ہی سگریٹ اور چائے نوشی ترک کرنے کی مہم کے خاتمے کا باضابطہ اعلان ہے۔ اس کے بعد وہ اس 'حاذق' حکیم صاحب کا ذکر بھی نہیں کرتے۔

والد صاحب کے اعزاز میں ان کے ایک شاگرد زُہیر کنجاہی صاحب نے ایک مشاعرہ کا اہتمام راولپنڈی میں کیا ہے۔ جو چھوٹا سا قافلہ شعرا کا لاہور سے راولپنڈی جارہا ہے اس میں بھی خالد علیم صاحب ہمارے ساتھ ہیں۔ رات بھر رک رک کر چلتی مینیجر ٹرین کا یہ سفر بہت دل چسپ اور 'سبق آموز' ہے۔ ہمارے ساتھ ٹرین میں یزدانی صاحب کے علاوہ جناب راز کاشمیری، جناب انور ملک، ڈاکٹر تبسم رضوانی، جناب یونس حسرت امرتسری،

جناب خالد یزدانی اور جناب افضل اقبال (حنیف) بھی سفر کر رہے ہیں۔

اکثر تو شاعر ادیب والد صاحب سے ہی ملنے ہمارے ہاں آتے ہیں مگر کبھی کبھی مجھ سے ملنے بھی آ ہی جاتے ہیں۔ ایسے مواقع پر میں محسوس کرتا ہوں کہ جعفر بلوچ اور عظیم قریشی صاحبان کی موجودگی میں اگر خالد علیم صاحب اور افضل اقبال بھی موجود ہوں تو قہقہے تھمنے میں نہیں آتے۔ عظیم قریشی صاحب اپنی مختصر نظم سنا کر داد سے پہلے ہی ہاتھ اُٹھا اُٹھا کر بے اختیارانہ معصومیت سے ''شکریہ، شکریہ'' کہنے لگتے ہیں تو ہنسی روکنا واقعی مشکل ہو جاتا ہے۔ وہ کہتے ہیں:

''میں نے تین مصرعوں میں نظم ہٹ کر دی اور مشاعرہ لُوٹ لیا۔''

اس پر خالد علیم صاحب بے ساختہ کہتے ہیں:

''پھر تو آپ لُٹیرے ہوئے۔''

عظیم قریشی صاحب اِس پر بھی ''شکریہ، شکریہ'' کہے جاتے ہیں۔ اور پھر چند ساعتوں بعد معنی خیز انداز میں خالد علیم صاحب کی طرف دیکھنے لگتے ہیں۔ گویا کہہ رہے ہوں: ''اب سمجھا۔۔ تم باز نہیں آؤ گے شرارت سے۔''

خالد علیم صاحب ایک دردوں بھیں انسان ہیں۔ کم گو بھی اور کم آمیز بھی۔ طبیعت میں بلا کی سنجیدگی پائی ہے۔ مطالعہ کے شیدائی ہیں۔ رشتوں کے تقدس کو سمجھنے والے، رواداری اور احترام کے پروردہ۔ یہ سب خصائص انھیں ودیعت بھی ہوئے ہیں اور علیم ناصری صاحب کی تربیت کی دین بھی ہیں۔ وہ اپنے والد صاحب کا بہت احترام کرتے ہیں۔ ان کی کوئی بات ٹالنے کا تصور بھی نہیں کر سکتے۔ خالد صاحب انسان کی فلاح کے لیے دین سے وابستگی کو لازم سمجھتے ہیں۔ وہ اللہ اور اس کے رسولؐ سے غیر مشروط محبت کرتے ہیں اور اپنے قلم کو حمد و ثنا سے معطر رکھنے کے خواہاں ہیں۔ وہ بدعقیدگی اور شریعت سے روگردانی سے نالاں محسوس ہوتے ہیں۔ ان کا کہنا ہے کہ انسان کی کامیابی صرف اسلام کے اصولوں پر عمل درآمد سے مشروط ہے۔

خالد صاحب کے سینے میں ایک حساس اور محبت کرنے والا دل دھڑکتا ہے۔ صبح و شام کی رفاقت میں محبت پر بات ہوتی ہے تو سب سے پہلے انھیں اپنی والدہ یاد آتی ہیں جو بچپن ہی میں انھیں چھوڑ کر اللہ کو پیاری ہو گئیں۔ اور پھر مزید کریدوں تو اشارہ ملتا ہے کہ جوانی میں محبت کا احساس دو ایک بار تو ضرور بیدار ہوا۔ ایک بار تو زندگی بھر کے ساتھ کا ارادہ بھی باندھا مگر والد صاحب جناب علیم ناصری کے حکم پر قدم وہیں روک لیے اور پھر کبھی اس کوچۂ یار کا رُخ نہ کیا۔ ہاں، غزل کے کسی شعر، چائے کے کپ سے اٹھتی بھاپ اور سگریٹ کے

دھوئیں کے رقص میں اگر کوئی کسی کی یادوں کی شبیہہ تلاش کرلے تو کرلے ورنہ خالد صاحب اس بارے میں زبان نہ کھولیں گے۔ وہ میرے جذباتی ادوار کا کھوج بھی میری نظموں، غزلوں ہی سے تو لگاتے ہیں اور پھر حسبِ ضرورت علامتی انداز اور شائستہ لہجہ میں طبیعت پر چھایا احساسِ گرانی کم کرنے کا کوئی راستہ بھی دکھا دیتے ہیں۔

خالد علیم صاحب ہی کی وساطت سے میں ''ماہ نامہ فانوس'' اور اس کے مدیر قدیر شیدائی صاحب سے متعارف ہوا ہوں۔ خالد صاحب اس رسالہ کے مدیر معاون ہیں جب کہ مدیر علیم ناصری صاحب ہیں۔ ان کی مصروفیات کے باعث 'فانوس' کے چند شماروں کی ادارت میرے حصہ میں بھی آئی ہے۔ خالد علیم صاحب 'فانوس'، 'شام وسحر' اور 'سیارہ' میں تو شائع ہوتے ہیں مگر 'فنون' میں نہیں۔ یہ بھی میرا دوستانہ اعزاز ہے کہ میری خواہش پر وہ میرے ہم راہ احمد ندیم قاسمی صاحب سے ملنے مجلسِ ترقی ادب کے دفتر جاتے ہیں اور وہاں اپنی غزلیں بھی پہلی بار 'فنون' میں اشاعت کے لیے دیتے ہیں۔ پھر تو ان کی نعتیں، نظمیں اور رباعیات بھی 'فنون' میں شائع ہوتی ہیں۔ خالد علیم صاحب کہتے ہیں کہ اس دور میں ندیم صاحب سے زیادہ رباعی کی صنف کی حوصلہ افزائی کرنے والا اور اسے سمجھنے والا شاید ہی کوئی اور ہو۔

خالد احمد صاحب نے ''بیاض'' جاری کیا ہے۔ ہم سب دوست کھل اٹھے ہیں۔ ہم سب کی تخلیقات اس جریدہ کی زینت بننے لگی ہیں۔ خالد علیم صاحب بھی اس میں اپنی تخلیقات بھیجتے ہیں۔ خالد احمد صاحب کے کہنے پر میں نے خالد علیم صاحب کو بھی 'امروز' کے اس انٹرویو پینل میں شامل کرلیا ہے جو عبدالعزیز خالد، انیس ناگی، طفیل ہوشیارپوری اور کئی دوسرے سینئر لکھاریوں کے یادگار انٹرویوز ریکارڈ کر رہا ہے۔ خالد علیم صاحب جناب خالد احمد کے اشعار میں موجود معنوی گہرائی اور فنی حسن کے گرویدہ ہیں اور انھیں عصرِ حاضر کی ایک منفرد آواز قرار دیتے ہیں۔ ''تشبیب'' اور ''ہتھیلیوں پہ چراغ'' میں خالد احمد صاحب کی شاعری خالد علیم صاحب سمیت ہم سب کو مسحور کیے ہوئے ہے۔

میں ریڈیو وائس آف جرمنی سے منسلک ہو کر کچھ برس کے لیے جرمنی چلا آیا ہوں۔ اب خالد صاحب کے ساتھ خطوط کے ذریعہ رابطہ رہتا ہے۔ ان دنوں وہ 'سیارہ' سے وابستہ ہیں۔ میں انھیں اس رسالہ کے لیے تخلیقات بھیجا کرتا ہوں جنھیں وہ محبت سے شائع کرتے ہیں۔

خالد علیم صاحب کچھ عرصہ سعودی عرب میں گزار کر لوٹے ہیں اور اب لاہور میں ایک کمپوزنگ سنٹر بنانے کا ارادہ رکھتے ہیں۔ وہ بتاتے ہیں کہ عرب کے صحرا میں رات کا منظر عجب سحر انگیز ہوتا ہے۔ وہ سعودیہ کے بعض قوانین پر تنقید بھی کرتے ہیں اور بعض کی تعریف بھی کرتے ہیں۔ وہ مکہ معظمہ میں خانۂ خدا پر حاضری اور مدینہ شریف میں روضۂ رسولؐ کی زیارت کے واقعات بھی سناتے ہیں اور ان دونوں مقدس مقامات پر حاضری کے دوران اپنی کیفیات میں فرق کا ذکر بھی کرتے ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ دونوں مقامات پر ان کی آنکھوں سے آنسو جاری ہو گئے۔ کعبۃ اللہ پر نظر پڑتے ہی ہیبت سے جب کہ روضۂ رسولؐ پر حاضری کے وقت رقتِ قلب اور احساسِ ندامت سے۔ وہ یہ بھی بتاتے ہیں کہ روضہ رسول کے قریب انھیں ایک ایسی دل نواز خوشبو آتی تھی جو انھوں نے پہلے کبھی محسوس نہیں کی۔ یہاں تک کہ یہ خوشبو ملحقہ بازار میں بھی محسوس ہوتی رہی۔

وہ مکہ اور مدینہ کے رہائشیوں کے طرزِ عمل اور اخلاق میں بھی فرق کی نشان دہی کرتے ہیں۔

خالد علیم صاحب نے 'الاشراق' کے نام سے اشاعتی ادارہ قائم کیا ہے۔ میرے دو شعری مجموعے ''گہری شام کی بیلیں'' کا پہلا اور ''ابھی اک خواب رہتا ہے'' کا دوسرا ایڈیشن بڑی محبت اور اہتمام سے شائع کیے ہیں اور 'ابھی اک خواب رہتا ہے' کا دیباچہ بھی تحریر کر دیا ہے جس میں ہماری دوستی اور شعری ترجیحات پر مفصل بات کی گئی ہے۔ یہ تحریر مجھے از حد عزیز ہے کہ اس میں میری ذاتی اور ادبی زندگی کے ساتھ ساتھ اس دور کی پوری ادبی فضا کو اجاگر کیا گیا ہے۔ اس تحریر میں خالد صاحب کی نثر نگاری کا حُسن دیکھا جا سکتا ہے۔

آغازِ دوستی پر بات کرتے ہوئے وہ دیباچہ میں رقم طراز ہیں:

''بات کچھ زیادہ پرانی نہیں، میں اور حامد یزدانی، بلکہ حامد یزدانی اور میں — دونوں کبھی ایک سفر پر نکلے تھے۔ اس سفر کی منزل کہاں تھی، اُس وقت تو کچھ زیادہ معلوم نہ تھا البتہ ہم دونوں نے ایک خواب ضرور دیکھا تھا — اور وہ خواب تھا، چلتے رہنے کا، مسلسل آگے بڑھنے کا۔ ایک دُھن تھی انسانوں کی دُنیا سے باہر نکل کر انسانوں کی دنیا کو سمجھنے پر کھنے اور نو بہ نو حقیقتیں معلوم کرنے کی۔ میں اس سفر میں اُس کے ساتھ صرف اس لیے نہیں تھا کہ حامد یزدانی اپنے اس خواب میں پُرعزم تھا۔ میرا ساتھ تو اُس کی دوستی میں تھا۔ جہاں وہ خوش وہاں میں خوش۔ جہاں وہ ناراض، وہاں میں ناراض —''

سچی بات یہ ہے کہ خالد علیم صاحب بہت حساس انسان ہیں مگر باقاعدہ ناراض کم کم ہوتے ہیں۔ ان کا انکسار، خلیق مزاج اور نرم

خوئی ہر ملنے والے کو متاثر کرتی ہے۔ میں جرمنی سے لوٹ آیا ہوں۔ اب پھر ہم متواتر ملنے لگے ہیں۔ والد صاحب کی برسی پر شیزان ریستوران میں احمد ندیم قاسمی صاحب کی صدارت میں تقریب کا اہتمام ہے۔ اظہار خیال کرنے والوں میں شہرت بخاری صاحب، حفیظ تائب صاحب، خورشید رضوی صاحب، سرفراز سید صاحب، خالد احمد صاحب، جعفر بلوچ صاحب، اسرار وڑائچ صاحب اور طارق کامران صاحب شامل ہیں۔ نظامت کے فرائض ڈاکٹر اجمل نیازی صاحب کے سپرد ہیں۔ شہر کے سبھی اہم ادبی احباب اس میں شریک ہیں سوائے خالد علیم صاحب کے۔ اس تقریب میں خالد احمد صاحب نے جو مضمون پڑھا ہے اس میں جناب علیم ناصری اور جناب خالد بزمی سے دوستانہ چھیڑ خانی کی گئی ہے۔ خالد احمد کو جاننے والے سب محظوظ ہوئے ہیں۔ یہ مضمون اتنا دل چسپ ہے کہ جناب عمران نقوی اسے نوائے وقت کے ادبی ایڈیشن میں بھی شائع کرتے ہیں۔ اس مضمون کی اشاعت کے کچھ روز بعد خالد علیم صاحب میرے گھر آتے ہیں اور خالد احمد صاحب کے مضمون میں علیم صاحب کے ذکر پر خفگی کا اظہار کرتے ہوئے مجھ سے گلہ کرنے لگتے ہیں۔ میں صفائی پیش کرتا ہوں۔ خالد احمد صاحب کے مزاج کا حوالہ دیتا ہوں۔ یہاں تک کہ ان کے ساتھ خالد احمد صاحب اور جناب عمران نقوی کے پاس چلنے کی پیش کش بھی کرتا ہوں کہ میری طرف سے ان کا دل صاف ہو جائے مگر وہ میری ایک نہیں سنتے اور خفا ہو کر چلے جاتے ہیں۔ اور میں ناکردہ گناہی کی اس سزا پر وہیں چپ کھڑا رہ جاتا ہوں۔ ایسے میں احمد ندیم قاسمی صاحب کا شعر ذہن میں گردش کرنے لگتا ہے:

جب ترا حکم ملا، ترک محبت کر دی
دل مگر اس پہ وہ دھڑکا کہ قیامت کر دی

اگست ۱۹۹۹ کی ایک شام۔

کل میں لاہور کو خیر باد کہہ کے مستقل سکونت کے لیے بیگم اور بچوں کے ساتھ کینیڈا کیلیے روانہ ہو رہا ہوں۔ خالد علیم صاحب سے الوداعی ملاقات کرتا ہوں۔ وہ فراخ دلی سے اعتراف کرتے ہیں کہ کسی شخص نے خالد احمد صاحب کے مضمون کے ضمن میں انہیں اکسا کر ہمارے درمیان غلط فہمی پیدا کر دی تھی جس پر وہ نادم ہیں۔ میرے پاکستان چھوڑنے کے فیصلہ پر وہ کچھ اداس دکھائی دیتے ہیں۔ میں انھیں یقین دلاتا ہوں کہ یہ مکانی فاصلہ ہمارے تعلقِ خاطر کو کم زور نہیں کر سکے گا۔ وہ شاید نہ چاہتے ہوئے مجھے 'الوداع' کہتے ہیں۔ مگر بعد ازاں جب بھی بات ہوتی ہے تو وہ میرے نقل مکانی کے بروقت فیصلہ کو سراہتے ہیں۔ جب بھی ان سے بات ہوتی ہے گھر والوں کی، بچوں کی خیر خیریت دریافت کرنے کے بعد ادب پر، شہر لاہور کی

ادبی فضا پر، معیشت پر، سیاست پر، اخلاقیات پر۔۔۔ ہر موضوع پر کھل کر بات کرتے ہیں۔ وہ ملک میں جاری ظلم، زیادتی، حق تلفی اور بدعنوانی کے خلاف حرف کا احتجاج کرتے ہیں۔ ان کی شاعری میں اب مزاحمتی ادب کا رنگ در آنے لگا ہے۔

ایک روز مجھے فون کرتے ہیں اور ادبی رسالہ ''ترسیل'' کے اجرا کا ارادہ ظاہر کرتے ہیں اور مجلس ادارت میں اپنے ساتھ مجھے بھی شامل کرنا چاہتے ہیں۔ میں تو اس اقدام پر خوش ہوں۔ مگر، افسوس، ان کا یہ خواب بوجوہ تعبیر آشنا نہ ہو پایا۔ وہ بدستور 'فانوس' کی ادارت کے فرائض انجام دیتے رہتے ہیں۔ 'فانوس' میں 'شعائیں' کے عنوان سے ان کے اداریے انتہائی فکر انگیز ہوتے تھے۔ ایک شمارہ میں ایک خصوصی گوشہ میرے حوالہ سے بھی شامل کرتے ہیں۔ ان کا کلیات، جس میں میرا تحریر کردہ ایک مضمون بھی شامل ہے، منظر عام پر آتا ہے تو اس کا ایک نسخہ بطور خاص مجھے کینیڈا بھجواتے ہیں اور اس پر رائے لکھنے کی فرمائش بھی کرتے ہیں۔ وہ دوستوں کی اور ان کی تخلیقات کی دل سے قدر افزائی کرتے ہیں اور جہاں مناسب ہوتا ہے بہتری کے لیے مشورہ بھی دیتے ہیں۔

'بیاض' نے اپنے تازہ شمارہ کے سرورق پر خالد علیم صاحب کی تصویر شائع کی ہے اور اندر ان کے لیے ایک خصوصی گوشہ پزیرائی بھی شامل کیا ہے۔ میں بھی ان کے لیے ایک نظم لکھتا ہوں اور نوید صادق صاحب کی وساطت سے انھیں بھیجتا ہوں۔ نوید صاحب بتاتے ہیں کہ خالد صاحب کو نظم بے حد پسند آئی۔ اس میں بھی ہماری دوستی، ہمارا عہد اور ان دنوں کی مصروفیات و مشاغل تخلیقی انداز میں پیش کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔

لاہور سے امی جان کے انتقال کی خبر آتی ہے۔ میں بہت دکھی ہوں۔ خالد علیم صاحب افسوس کا فون کرتے ہیں اور ایک نظم مجھے بھیجتے ہیں ''حامد یزدانی۔ فیس بک کے آئینے میں'' جو ہے تو میرے نام مگر اس میں امی جان کی شفقت اور اس دور کے مہربان ماحول کی زبردست عکاسی کی گئی ہے۔ میں ان کا شکریہ ادا کرتا ہوں۔ یہ نظم بھی میرا قیمتی اثاثہ ہے۔

سال ۲۰۲۴۔

اب خالد علیم صاحب نے یہ خوش خبری سنائی ہے کہ وہ جناب عباس تابش کے کہنے پر مجلس ترقی ادب کے لیے 'کلیات یزدانی جالندھری' ترتیب دے رہے ہیں۔ میں انھیں مبارک باد بھی دیتا ہوں اور ان کا شکریہ بھی ادا کرتا ہوں۔ انھیں والد صاحب کا کچھ غیر مطبوعہ کلام بھی بھیجتا ہوں۔

مجھے یاد آتا ہے۔ کچھ برس قبل میں والدہ صاحبہ سے ملنے چند روز کے لیے لاہور گیا تھا تو اپنے ادبی احباب سے ملنے کا وقت نہ مل سکا تھا۔ ہاں، خالد علیم صاحب سے اکثر شام کو ملاقات رہتی۔ جس میں ہم ان سب بیتے دنوں کی یادیں تازہ کرتے اور دل کی باتیں کرتے۔ حقیقت یہ ہے کہ میں دنیا میں جہاں بھی رہا خالد علیم صاحب کی دوستی کی مہک میرے احساس کے دامن سے لپٹی رہی۔ وہ میرے اوّلین ادبی دوست تھے اور ہیں۔ میں ان کی زبردست تخلیقی صلاحیتوں کا معترف ہوں اور ان سے دوستی پر نازاں ہوں۔ دکھ ہے تو اس بات کا کہ وقتِ رخصت میں اپنی کسی بھی محبوب ہستی کے پاس نہ تھا؛ نہ والد صاحب کے، نہ خالد احمد صاحب کے اور نہ خالد علیم صاحب کے۔ مکانی فاصلوں کی یہ قیمت تو مہاجرت میں چکانا ہی پڑتی ہے۔ یہ حقیقت ہے۔ ایک تلخ حقیقت --- اور اس حقیقت سے انحراف ممکن نہیں۔ مگر یہ امر بھی اپنی جگہ سچ ہے کہ فکری قُرب اور احساسِ تعلق اخلاص پر استوار ہو تو محبتیں سلامت رہتی ہیں۔

باہر اب بھی برف باری جاری ہے۔ محکمۂ موسمیات کے مطابق یہ برفانی طوفان جلد ختم ہونے والا نہیں۔ میں اس وقت باہر کے موسم سے کٹا ہوا ہوں۔ اندر آتی جاتی رُتوں کے دوش پر جو سوار ہوں۔ وہ سائیکل اب کہاں جس پر دوستی کا آغاز ہوا تھا! وہ دل نشیں آواز، وہ دھیما دھیما لہجہ، وہ معصوم اور خالص مسکان، وہ گلے شکوے، وہ منصوبے اور عزم --- سب دھندلے پڑتے جاتے ہیں۔

میں کمرے میں دبکا یہ سب سوچ رہا ہوں اور اپنے اندر جھانک رہا ہوں۔ دوستی کی نصف صدی کا سفر چند پلوں میں کیوں کر ممکن ہے؟ پھر بھی، دھڑکنوں کی طرح بے ترتیب ہی سہی، ان یادوں کی جھلکیوں کو کاغذ پر اتارنا تو ہے۔ ساتھ ساتھ خود کو باور کروانے کی کوشش بھی کر رہا ہوں کہ میں ایک باہمت اور حوصلہ مند انسان ہوں اور یہ کہ یہ غم بھی کسی نہ کسی صورت جھیل ہی جاؤں گا مگر کیا کیا جائے کہ ایسے میں خالد علیم صاحب کا مصرعہ ہی ذہن میں گونج گونج کر میری آنکھیں نم کیے دے رہا ہے:

روکتے روکتے بھی آنکھ چھلک پڑتی ہے
اور میں دیکھتا ہوں کہ میرے ہاتھوں میں تھما ورق بھی پلکوں کی طرح بھیگتا جا رہا ہے۔

☆☆☆☆☆

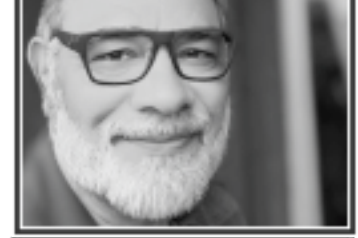

حامد یزدانی

مجھے کہیں تر انعم البدل نہیں ملتا

شاید میرے لیے دنیا کا سب سے مشکل کام ابا جی کے بارے میں قلم اٹھانا ہے ان سے میرا خون کا ہی نہیں محبت احترام خوف اور استاد شاگرد کا بھی رشتہ ہے وہ میرے باپ ہی نہیں محسن بھی ہیں اور مرشد بھی جو آخری دم تک بھی مجھے انگلی پکڑ کر چلاتے رہے جن کے سامنے میں بچوں والا ہو کر بھی بچہ بن جاتا۔

یہ سارے رشتے گوشت کے ریشوں کی طرح اک دوسرے میں پیوست ہیں۔

ابا جی کے آباؤ اجداد کا تعلق امرتسر کے ایک گاؤں اچوگل سے تھا جو اب زیرو لائن پہ آ گیا ہے بیدیاں نہر کے کنارے وہی بیدیاں نہر جہاں پینسٹھ کی جنگ میں میجر عزیز بھٹی داد شجاعت دیتے ہوئے شہید ہوئے ابا جی کے دادا گاؤں میں بھیڑ بکریوں کا کاروبار کرتے اور دادی ہندو بنیاؤں کی طرح چھوٹا موٹا ساہوکارہ۔ دادا کا نام شیر دین اور دادی کا نام قایم بی بی تھا میرے دادا پانچ بھائیوں میں چوتھے نمبر پر تھے اور برٹش آرمی کے ہندوستانی ونگ کی آرمڈ کور میں نرسنگ حوالدار تھے والد کے دادا تو پہلے ہی مر چکے تھے دادی تقسیم کے وقت راہی اجل ہو گئیں۔

آبائی زمین اڑہائی تین ایکڑ تھی جسے دادا کا بڑا بھائی کاشت کرتا مگر پاکستان بننے کے بعد اسے بھی خدا حافظ کہنا پڑا۔

ابا جی والدین کی سب سے بڑی اولاد تھے نام ان کا اصغر علی تھا آزادی کے وقت ان کی عمر بارہ سال تھی یہ خاندان نقل مکانی کے دکھ جھیلتا ہوا اوکاڑہ آ گیا جہاں پہلے شہر میں ایک مکان میں بسرام کیا دادا شریف آدمی اور بچے چھوٹے کسی بااثر آبادکار نے عملے کے تعاون سے اس مکان سے اٹھا دیا تب

مسعود احمد

یہ خاندان سکھوں کے چھوڑے ہوئے محلے کوٹ نہال سنگھ میں آ گیا جہاں سات آٹھ مرلے کے خالی پلاٹ پر اللہ کا نام لے کر بیٹھ گئے دادا ان دنوں بری طرح آشوب چشم کا شکار تھے دادی بیچاری نے بچوں کی مدد سے خود گارا بنا کر اینٹ روڑوں سے چار دیواری کا بندوبست کیا جیسے تیسے مل جل کر ایک کچا کوٹھا بھی بنا لیا دال روٹی کے لیے کسی کا کچھ نہ کچھ کرنا ضروری تھا بڑے بیٹے یعنی میرے ابا کی عمر بارہ سال تھی وہ مزدوری کی تلاش میں نکلے اوکاڑہ سٹیشن پر ان دنوں مال گاڑیوں سے کوئلہ اتارا جاتا تھا ابا مزدوری کے لیے قطار میں کھڑے ہو گئے جب باری آئی تو موقع پر موجود منشی نے بچہ کہہ کر نکال دیا وہ دربارہ لائن میں لگ گئے پھر باری آئی تو انھوں نے منیم کی منت کی مجھے اور میرے گھر کو نوکری کی شدید ضرورت ہے اس کا دل پسیج گیا یوں ابا جی کی پہلی کمائی ایک روپیہ یومیہ لگی دادا خوش تھے بیٹا بانہہ بیلی بن گیا ہے مگر ابا جی آتے جاتے سکول کو حسرت بھری نظروں سے دیکھا کرتے تھے ماں تو ماں ہوتی ہے ماں کے دل سے بیٹے کا حال کب تک اوجھل رہتا اس لیے ممتا اڑ گئی بیٹے کو سکول داخل کروا کے دم لیا دادا نے بہتیرے ہاتھ پاؤں مارے مگر ماں بچوں کی محبت میں چٹان ہوتی ہے کہا پیٹ پر بھلے پتھر باندھ لوں مگر بیٹے کو پڑھاؤں گی۔

ابا جی نے مڈل کا امتحان ستلج سکول سے دیا غالباً لاہور بورڈ سے آج بھی ستلج سکول کے بورڈ آف آنر پر انکا نام ہے۔

غریب گھر تھا ان دنوں کم وبیش نقل مکانی کر کے آنے والے سب مہاجرین کا یہی حال تھا۔

ابا جی نارووال چلے گئے وہاں سے جونیر ورنیکلر کا امتحان پاس کیا اور پرائمری ٹیچر ہو گئے پہلی تقرری شاید پاک پتن کے کسی مضافاتی سکول میں ہوئی پھر پاک پتن جو ان دنوں تحصیل ہوا کرتا تھا کے کسی نواحی سکول میں تعینات ہو گئے اور پاک پتن میں کوئی کمرہ کرائے پر لے لیا۔

ابا جی کا رنگ سرخ سفید قد درمیانہ بڑی بڑی ذہانت سے بھرپور آنکھیں بال جوانی کیا لڑکپن سے ہی سفید تھے اکثر شلوار قمیض پہنتے عمر کوئی تیس چوبیس سال حالات کے تھپیڑوں اور گھر سے دور رہنے کی وجہ سے اگر ان کے پاس کچھ تھا تو وہ اعتماد کی دولت تھی جس سے وہ مالا مال تھے شادی کی عمر تھی پوچھ تاچھ کر براہ راست میرے نانا جی سے جا ملے نانا ریٹائرڈ پٹواری تھے ایک دو ملاقاتوں میں ان سے رشتہ کے طلبگار ہو گئے لڑکا کماؤ تھا وجیہہ ہونا بھی بڑی خوبی تھی لہٰذا میرے دادا دادی کی نانا سے رسمی

ملاقات کے بعد بات پکی ہوگئی اور چودہ سال کی عمر میں جب لڑکیوں کے کھیلنے کودنے کی عمر ہوتی ہے میری اماں نے ماسٹر کرلیا ورنہ ماسٹر کرنے میں تو کسی بھی یونیورسٹی سے بائیس تئیس سال لگ ہی جاتے ہیں یہ دسمبر 1958 کی بات تھی اور 26 ستمبر انیس سو ساٹھ کو اپنے والدین کے ہاں میں پہلی اولاد ہوا۔

ابا جی کو روٹی کے علاوہ کسی چیز کا نشہ نہیں تھا زیادہ سے زیادہ شام کو ایک سگریٹ پی لیا کرتے تھے۔

دادی بتاتی تھیں ایک دفعہ اصغر کو ڈبل نمونیا ہوگا کسی نے کہا اگر لڑکے کو برانڈی پلا دی جائے تو ٹھیک ہوسکتا ہے مگر ابا جی نے برانڈی پینے سے انکار کردیا کہ جس کام سے اللہ اور اس کے رسول نے منع کیا ہے وہ نہیں کروں گا اگر آرام دینے والے نے دینا ہے تو برانڈی کے بغیر بھی دے دے گا۔

اخلاقی طور پر کردار ہمیشہ سفید لٹھے کی طرح بے داغ رہا اپنے بیٹوں کو بھی ہمیشہ یہی نصیحت کرتے اگر تمہارا کردار ٹھیک ہے تو سمجھو تمہارا گھر ٹھیک ہے اس پر ساری عمر کاربند رہے اور پروردگار نے بھی ان کا خوب ساتھ دیا۔

ابھی میں دودھ پیتا بچہ تھا جب ابا جی نے تبادلہ پاک پتن سے اوکاڑہ کروالیا پھر وہ پہلے 2/4I اور بعد میں چک 1/4I میں پڑھاتے رہے پھر ملٹری فارم 4/4I کے سنٹر ہیڈ ماسٹر ہوگئے تب تک میرے دو بھائی اور ہوچکے تھے۔

ہمارے گھر میں امی پہلے قاعدہ جوڑوں کے ساتھ پڑھاتیں تختیاں لکھواتیں سو تک گنتی یاد کرواکے پہلی دوسری کا حساب پڑھاتیں پھر تیسری میں سکول داخل کروایا جاتا چنانچہ میں تیسری میں ستلج ہائی سکول داخل ہوگیا ابا جی روز سائیکل پر سکول جاتے کم وبیش تین چار کلومیٹر فاصلہ دیہاتی سکول تھا لوگوں میں محبت رواداری اور احترام کے رشتے ابھی ناپید نہیں ہوئے تھے ملٹری فارم سے کبھی کوئی شاگرد ساگ دے جاتا تو کبھی مکئی کی چھلیاں گرمیوں میں چھولیا کپاس کی چھڑیاں ٹرالی میں آتیں ڈھیر لگ جاتا جنھیں گرمیوں میں جلایا جاتا فوراً آگ پکڑ لیتیں کچا چھولیا نکالا جاتا اور پکے کی ہولیں جلا کر بنائی جاتیں جو پورا گھر شوق سے کھاتا اکتیس مارچ نتیجے کے دن گھر گلاب کے ہاروں سے مہک اٹھتا مٹھائی بھی خوب آتی۔

پانچویں میں سائیکل چلانے لگا اور سائیکل پر ملٹری فارم سے ستا دودھ لے کے آتا مت پوچھیے سڑک پر سائیکل کی سواری کیا کیا مزہ تھا سڑک پر ٹریفک کی ایسی بڑبونگ

کہاں ہوتی تھی پھر فارم سے چار چک تھا کچی مگر صاف سڑک اب ایسا مزہ گاڑی میں بیٹھ کر بھی کہاں آتا ہے۔

ابا جی مزاج کے ذرا تلخ تھے یہ تلخی شاید زندگی کی مشقت نے ان میں بھر دی تھی گرمیوں کی چھٹیوں میں یا تو ہم ننھیال جاتے ورنہ ابا کے ساتھ لاہور جہاں وہ ہمیں بادشاہی مسجد عجائب گھر چڑیا گھر شالا مار باغ اور مینار پاکستان دکھاتے ایک دو دفعہ جہانگیر اور نور جہاں کے مقبرے پر بھی لے کر گئے۔

ابا عموماً ٹرین کا سفر کرتے ہر سٹیشن پر اتر جاتے میں انتظار میں پریشان ہو جاتا گارڈ کی سیٹی کی آواز سنائی دیتی تب کہیں سے ابا جی نمودار ہوتے اور میری جان میں جان آتی۔ سوتا بھی ابا جی کے ساتھ تھا سردیوں میں وہ مجھے بستر کے گدے کے اوپر رضائی فولڈ کر کے سلاتے چاہیے اپنے لیے رضائی بچے نہ بچے ایک دفعہ میں اور چھوٹا بھائی اشرف ابا جی کے ساتھ فیصل آباد سے اوکاڑہ آ رہے تھے راوی پتن پر پہلے بحث اور پھر کچھ دیہاتیوں سے جھگڑا ہو گیا والد صاحب نے ڈرنا تو سیکھا ہی نہیں تھا اُدھر ہم دونوں بھائی سہمے ہوئے یہ دیہاتی ابا جی کو دریا میں دھکا ہی نہ دے دیں۔

مگر آلا ٹالا ہو گیا اور ہم دونوں بھائیوں کی سانس میں سانس آئی ابا جی اپنے والد محترم کو والہانہ پیار کرتے تھے اور ان دنوں یہ کوئی انہونی بات نہیں تھی عموماً لوگ اپنے والدین سے پیار کیا کرتے تھے میں کوئی آٹھ سال کا تھا جب معمولی بخار کے بعد دادا جی گزر گئے ابا جی نے ان کی بہت اچھی پختہ قبر بنوائی اور ہر ہفتہ ہم بھائیوں کو دادا کی قبر پر لے کے جاتے قبر دھوتے فاتحہ پڑھتے اور ہر سال برسی پر درس سے حفاظ بلا کر قرآن خانی کرواتے ایک دفعہ نو جولائی کو دادا کی برسی کے دن ابا جی اسلام آباد تھے میں بچپن سے دیکھتا آیا تھا کہ برسی والے دن گھر میں قرآن خانی ہوتی ہے۔ جب ابا جی واپس آئے تو اداس تھے کہ اس دفعہ والد کی برسی پہ میں گھر موجود نہیں تھا جب دادی ماں نے بتایا کہ قرآن خانی 'سودے' نے کروادی تھی تو ابا جی بہت خوش ہوئے دادی اماں مجھے ہمیشہ 'سودا' کہہ کر پکارتیں۔

وہ میری مونس و غمخوار تھیں ابا جی پانچویں تک پڑھائی کے معاملات میں اتنا دخل نہیں دیتے تھے مگر چھٹی میں پکڑ لیتے حساب ان کا تیز تھا پرائمری میں سولہ تک پہاڑے اور ٹوکوین ہندسے تو امی کروا دیتیں جوڑ توڑ سے قاعدہ پڑھنے کا فایدہ یہی ہوا پہلی دوسری میں اخبار پڑھ لیتے مگر یہ پرانی باتیں تھیں حساب میں ابا جی کے آگے دم مارنا مشکل ہوتا گھر میں ایک چھوٹی سی

بیٹھک جس میں ایک چارپائی ایک دو کرسیاں اور چارپائی کے نیچے جلانے والی لکڑیاں حساب کا مضمون کیا شروع ہوتا ہمارا حساب شروع ہو جاتا ذرا سی غلطی پر چارپائی کے نیچے سے ابا جی لکڑی اٹھاتے اور یہ بھول جاتے مضروب ان کا اپنا لختِ جگر ہے بس پھر کیا جتھے پینڈی پین دے میری چیخیں سن کر دادی اماں مدد کو آتیں باری میں کھڑے ہو کر بیٹے کو گالیاں دیتیں منڈا مار نا ای میری ماں جو خود بھی حالتِ ملال میں ہوتیں۔ دادی انھیں بھی گالیاں دیتیں بھراواں پئی نے منڈا مروا دینا اے مجھے آج تک سمجھ نہیں آئی دادی میری ماں کو گالیاں کیوں نکالتیں مگر ابا جی اپنی والدہ کا بے پناہ احترام کرتے تھے مجھے چھوڑ دیتے یہ مشق ہفتے میں کم سے کم دو بار تو ضرور دھرائی جاتی۔ ابا جی سکول جاتے وقت شلوار قمیض اور گرگابی پہنتے یا پشاوری چپل پینٹ پہنے میں نے اپنے بچپن میں بس ایک بار دیکھا سردیوں میں سوئیٹر یا جرسی کا اضافہ کرتے سردی میں کبھی کبھی گرم لوئی بھی اوڑھ لیا کرتے گرمی میں گھر میں صرف تہبند جسے دھوتی کہا جاتا باندھتے قمیض کسی بہت اہم آئے گئے کے اعزاز میں پہنتے ورنہ شاگردوں اور عام ملاقاتیوں سے دھوتی میں ہی مل لیتے پھر ابا جی کا تبادلہ پہلے ملٹری فارم ہائی سکول پھر گورنمنٹ ہائی سکول ریتالہ خورد ہو گیا انھوں نے میٹرک ایف بی اے اور کچھ تدریسی ڈپلومے دوران سروس پرائیویٹ کیے۔

والد محترم کثیر العیال تھے تین بہنیں اور چھوٹے تین بھائی میری ایک پھوپھو بہری تھیں جو رحیم یار خاں بیاہی تھیں ان کے میاں ان کے پھوپھی زاد تھے پتہ نہیں کیا اختلاف تھا ابا جی ان کے گھر نہیں جاتے تھے بہن کو گھر کے دروازے پر ہی چھوڑ آتے دادی کہتیں بیٹا ہم دھیوں کے گھر کا پانی نہیں پیتے میں ہنس کے کہتا اماں پانی نہ سہی بوتل تو پی جا سکتی ہے اماں کہتیں نہ بچہ خیر سے کنبہ بڑا کرنے میں ابا جی نے بھی کسر نہیں چھوڑی ہم نو بہن بھائی تھے سات بھائی دو بہنیں اس کی ایک بڑی وجہ لوگوں کا خدا پر تکیہ تھا روزی رساں رب کی ذات ہے اور پروردگار بھی ان کے تیقن کا بھرم رکھتا ابا جی نوکری کے ساتھ تھوڑی بہت جنس بھی سٹور کرتے کبھی گندم کبھی چاول کبھی چینی گھر کے لیے بھی یہ چیزیں اکٹھی خریدیں جاتیں اس کے علاوہ وہ حکمت بھی کرتے مطب کا نام میرے نام کی مناسبت سے رکھا مسعود دواخانہ مطب کے لیے بھی وہی بیٹھک کام آتی جس میں راقم سے دوران پڑھائی حسن سلوک فرماتے مطب کی وجہ سے گھر کی دال روٹی بڑے احسن طریقے سے چلتی بچپن

میں شب برات کے تہوار پر وہ ہم بھائیوں کو پھلجھڑیاں انار اور چھوٹے پٹاخے خرید دیتے بڑے پٹاس والے پٹاخوں کی اجازت ہرگز نہیں تھی اسی طرح نیا جوتا ہمیشہ چھوٹی عید پر خریدا جاتا بوٹوں کو ترجیح دی جاتی وہ سکول میں بھی کام آ جاتے بے کپڑے عموماً چھوٹی اور بڑی عید پر میسر آتے جرسی یا سویٹر امی سلائیوں سے بنتیں جو ہم بہن بھائی سردیوں میں پہنتے پہلے میں کالج گیا پھر یکے بعد دیگرے دو چھوٹے بھائی اشرف اور ارشد بھی کالج پہنچ گئے مگر والد صاحب کے ماتھے پر شکن نہیں آئی۔

وہ تعلیم کو تعلیم کم اور ہنر زیادہ تصور کرتے انھوں نے ہم بہن بھائیوں کو سکول کالج اس لیے ڈالا کہ پڑھ لکھ کر کسی دفتر میں لگ جائیں گے تو ہمیں بیاہ کر وہ اپنے فرض سے سبکدوش ہو جائیں گئے بالکل ایسے جیسے لوگ بچوں کو فریجوں یا موٹر سائیکل کے کام پر ڈالتے کالج میں میرے لیے مضامین کا انتخاب بھی خود فرمایا میرے لیے ہی کیا سب بہن بھائیوں کے لیے سوائے آٹھویں کے وظیفے کے امتحان کے میرے ہر داخلہ فارم پر خود دستخط کرتے شاید پہلے شناختی کارڈ اور ڈومی سائل پر بھی انہیں کے دستخط تھے۔

آٹھویں کے فارم پر اس لیے نہیں کہ وہ ان سے چوری دیا تھا ایک دفعہ چھوٹے بھائی اشرف سے میں نے پوچھا جو سول انجینئر ہے لوکل گورنمنٹ میں شاید se ہے کہ تم کیا بننا چاہتے تھے کہنے لگا میں نے کیا بننا تھا جو بننا تھا ابا جی نے ہی بننا تھا۔

ابا جی کی شدید خواہش تھی ان کا کوئی بیٹا سب انجینئر جسے تب اوورسیئر کہا جاتا تھا بن جائے مجھے ڈالا میں بھاگ گیا اشرف کی خوش قسمتی داخلے کی تاریخ نکل گئی وہ ایف ایس سی کر کے یو ای ٹی لاہور سول انجینئرنگ میں چلا گیا ارشد جو ہم دونوں سے لائق تھا اللہ غریق رحمت فرمائے قابو آ گیا ابا جی نے اسے اوورسیئر بنا کر دم لیا یہ علیحدہ بات بعد میں وہ فیڈرل سروس کا امتحان کلیئر کر کے ایف آئی اے میں اسسٹنٹ ڈائریکٹر ہو گیا۔ میں پری میڈیکل میں داخل تو ہو گیا مگر میرا یہ مزاج ہی نہیں تھا ابا جی سے عرض گزاری اول تو مجھے آرٹس کرنے دیں یا پھر ایف ایس سی میں نان میڈیکل رکھ لینے دیں مگر درخواست رد فرما دی گئی۔

بیسویں صدی شاید ایجادات کی صدی تھی ستر کی دھائی میں مَیں ابھی سکول میں ہی تھا کہ محلے میں اکا دکا بلیک اینڈ وائٹ ٹی وی آنا شروع ہو گئے جس گھر میں ٹی وی ہوتا پورے محلے میں اس کا ٹور ہی الگ ہوتا۔

بچے تو بچے بڑے بھی شام کے چار بجے کے بعد ٹی وی کے گرد حصار باندھ لیتے کئی

بزرگ اسے کافروں کی سازش اور سراسر بے حیائی قرار دیتے میری دادی ان میں پیش پیش تھیں ہم بہن بھائیوں نے امی کے توسط سے ٹی وی خریدنے کی گزارش کی جسے دادی نے ویٹو کردیا کچھ دنوں کے لیے معاملہ سردخانے میں چلا گیا ابا جی سے منت سماجت کی کہ نیلام گھر بہت بڑا علمی اور ذہانت سے لبریز پروگرام ہے اس سے بچوں کا تدریسی معیار بہتر ہوتا ہے الغرض وہ سب دلائل دیے جو پطرس بخاری نے ہاسٹل میں داخلہ کے لیے دیے مگر خاطر خواہ نتائج برآمد نہ ہوئے پھر سوچا دادی کو قائل کیا جائے انھیں کہا اماں جی وہاں دینی پروگرام آتے ہیں نعتیں پڑھی جاتی ہیں قرآنی تعلیمات بھی وہیں سے حاصل کی جاسکتی ہیں اور یہ جو چھوٹے بھائی لوگوں کے گھر جاکر ٹی وی دیکھتے ہیں محلے میں ماسٹروں کے گھر کی کیا عزت رہ جائے گی دادی نے کہا ٹھیک ہے مگر پروگرام صرف مذہبی دیکھے جائیں گے گانا بجانا نہیں ہوگا ہم بہن بھائیوں نے کہا توبہ کریں جی یوں اماں جی نے ابا سے کہا اصغر ایاں توں ٹی وی لے دے اگلے دن ہمارے ہاں ٹی وی آگیا جس کے لیے پہلے دن ہم نے مبارکیں وصول کیں امی نے ریشمی غلاف سیا۔ جھالریں لگائیں چار پانچ بجے کے بعد ہم میں سے ایک آدھ بھائی تو انٹینا ٹھیک کرنے کے لیے مسلسل چھت پر ہی رہتا یہ کام ہم باری باری کرتے اتنی اہم ذمہ داری ایک بندے کو تھوڑے دی جاسکتی تھی۔

ابا جی کبھی ترنگ میں ہوتے تو ہمارے ساتھ اڈی کھڈا بھی کھیل لیتے کبھی پہلیاں بجھواتے اور کبھی دماغی سوالات کی مشق کبھی ہم بھائیوں میں بیت بازی میں شریک ہو جاتے۔ یہ جو واقعات بے ترتیب ہو رہے ہیں یہ بھی ابا جی کی پیش بینی تھی وہ کہتے تھے مسعود کوئی کام ڈھنگ سے نہیں کرسکتا۔

ابا جی کو روزہ رکھتے میں نے کبھی نہیں دیکھا تھا انھیں شوگر تو تھیں ہی مگر شاید ایک نفسیاتی خوف بھی وہ روزہ نباہ نہیں سکیں گے۔

نماز عید کے دن فجر کی ضرور پڑھتے پھر بچوں کو لے کر دادا کی قبر پر جاتے اور واپس آکر عید کی نماز ہمیشہ ستلج سکول کے گراونڈ میں مولانا غلام علی اوکاڑوی کے پیچھے پڑھتے قرآن پاک انھوں نے میری والدہ سے پڑھا۔

قربانی کبھی کبھار دیتے البتہ ہر بڑی عید پر یہ عزم ضرور کرتے ان شاءاللہ اگلے سال ضرور دیں گے قربانی کا تسلسل تب سے شروع ہوا جب میں بھی کمانے لگ گیا شاید پہلا بونس بڑی عید پر پونے چار سو روپے ملا اور ہم دونوں بھائی میں اور اشرف بکرا ڈھونڈ کر لائے ساتھ دعا کی پروردگار جتنا بھی بونس

ہوا کرے گا قربانی کی راہ میں خرچ ہوگا اور دوران سروس اس پر عمل بھی کیا۔

اباجی پھلوں میں گرمیوں میں آم اور سردیوں میں کینوں وافر لے کر آتے ہم بہن بھائیوں کو کاٹ کاٹ کر دیتے مگر خود وہی کھاتے جو ہم چھوڑ دیتے مجھے اس بات سے بڑی الجھن ہوتی کے اباجی سب کاٹ کر ہمارے حوالے کیوں کر دیتے ہیں اور ہمارا بچا ہوا کیوں کھاتے ہیں یہ عقدہ تب حل ہوا جب میں باپ بن گیا۔

اولاد سے محبت والدین میں قدرت کی طرف سے ودیعت کی جاتی ہے۔

والد صاحب ماں کے بہت فرمابردار تھے ایک دفعہ میری والدہ کو شدید بخار ہو گیا ٹمپریچر ایک سو چار سے بھی زیادہ تھا میں نویں میں پڑھتا تھا میرا ایک چھوٹا بھائی ہونے والا تھا اب بخار دیکھ کر میں پریشان تھا دادی سے ذکر کیا اماں میری امی کو ایک سو چار بخار ہے تو دادی نے کہا اے وی کوئی تاپ ہے۔ ایک دفعہ اصغر کے ابے کو یعنی میرے دادا جی کو تین سو ساٹھ درجہ تاپ ہو گیا تھا یہ ساس بہو کا رشتہ بھی کیا کمال کا ہے۔

ایف ایس سی میڈیکل میرے لیے بھاری پتھر تھا جس نے مجھے باغی کر دیا میں کلاس سے بھاگنے لگا تقریروں اور ادبی سرگرمیوں میں دلچسپی لینے لگا سلیم صاحب کیمسٹری پڑھاتے بہت پاٹ دار آواز تھی کسی جملے پر ناراض ہو کر کہنے لگے کل اپنے پیونو لے کے آیا کن پھڑ لے لہذا میں نے کلاس میں کان پکڑنے کو ترجیح دی پھر میں نے اباجی سے چھپ کر ایف اے کا امتحان دے دیا جیسے تیسے ایف اے کر لیا اوپر سے بدر کی رفاقت اور اسلم کولسری صاحب کی شاگردی میں شاعری کی طرف راغب ہو گیا۔ ظفر اقبال صاحب بھی حوصلہ افزائی فرمانے لگے ان دنوں مجھ پر ایک دو کالم داغ دیئے۔

اباجی کو پریشانی یہی تھی کہ شاعری میں پڑ کر برباد ہو جائے گا ان دنوں شاعری بھی اباجی سے چھپ کر کی جاتی حال ویسا ہی تھا جیسے بازار حسن سے تعلق رکھنے والی ایکٹریسز کہتی ہیں گھر بڑی سختی تھی بڑی مشکل سے فلموں میں کام کی اجازت ملی میرے ساتھ ایسا سچ مچ ہوا سرزنش کیا دو تین بھی ہوئی اباجی شاعری کو سراسر کارزیاں سمجھتے انکے نزدیک ایسا ہر کام کارزیاں تھا جس سے آپ دال روٹی نہ کما سکیں اس لیے شاعری اباجی سے چھپا کے کرتا اور وہ تو تب تک بھی چھپ کے ہی کرتا رہا جب بینک میں بابو ہو گیا اللہ بھلا کرے اوکاڑہ کے پہلے ڈپٹی کمشنر طارق محمود صاحب کا جنھوں نے میری سفارش اباجی سے کر دی یہ اچھا شاعر ہے ایک تو میں نوکر ہو گیا تھا دوسرا ڈی سی صاحب کی تصدیق تب اباجی نے اس

حوالے سے مجھ پر ہاتھ ہولا رکھنا شروع کر دیا۔ ابا جی سے کہا یا تو مجھے بی اے میں داخلہ لے دیں یا پھر کوئی نوکری دلا دیں انھیں دنوں میں حبیب بینک اور نیشنل بینک میں کیشئرز کی آسامیاں آئیں تحریری امتحان نیشنل بینک کا ملتان اور حبیب بینک کا مظفر گڑھ تھا امتحان تو میں نے دونوں پاس کر لیے مگر ساتھ ابا جی کی محنت کا عمل دخل بھی تھا میری دونوں جگہ سلیکشن ہو گی تب حبیب بینک کی ساکھ زیادہ بہتر تھی حبیب بینک میں پہلی تقرری ڈی جی خان کے نواحی قصبہ شاہ صدر دین موضع پکی میں ہوئی تب میری عمر کوئی اٹھارہ سال اور چند ماہ تھی۔

برانچ کی عمارت ابھی بن رہی تھی ڈی جی خان فیصل آباد روڈ پر ایک کچی بیٹھک میں بینکاری کا آغاز کیا گیا بجلی تھی نہیں رفع حاجت کے لیے بھی ملحقہ قبرستان کے قریب جانا پڑتا نہانا سڑک کنارے نلکے پر ہوتا ایک ماہ بعد اچانک علی الصبح ابا جی شاہ صدر دین آئے دسمبر کے دن تھے اور میں نلکے پر نہا رہا تھا دیکھ کر ابا جی آبدیدہ ہو گئے کہنے لگے چھوڑو یار گھر چلو میں نے تسلی دی مگر وہ وہیں سے سیدھا کراچی روانہ ہو گئے تا کہ میرا ٹرانسفر اوکاڑہ ہو سکے انہیں دنوں میرے بینک میں بالکل کورا ہونے کی وجہ سے مجھے ڈی جاں خان ٹرانسفر کر دیا گیا ابا جی نے میری رہائش کا بندوبست گورنمنٹ ہائی سکول نمبر 1 ڈی جی خان کے ہاسٹل میں کروا دیا تقریباً چھ ماہ بعد ابا جی کی کوششوں سے میرا تبادلہ اوکاڑہ منڈی روڈ برانچ میں ہو گیا۔ مجھ سے چھوٹا بھائی اشرف انجینئرنگ یونیورسٹی چلا گیا تو ابا جی کی خوشی دیدنی تھی۔

میرے نوکری لگنے سے ابا جی کے حوصلے بلند ہو گئے محنت ان کے مزاج کا لازمی جزو تھی کبھی آرام سے نہ بیٹھتے ہمیشہ وقت کے ساتھ ساتھ دوڑنے کی کوشش کرتے یہی مثال دیتے گاڑی کہاں سے کہاں پہنچ گئی رات کہیں بھی ہوتے صبح وقت پر سکول پہنچ جاتے تب تک ان کا ٹرانسفر بھی ستلج ہائی سکول اوکاڑہ ہو چکا تھا میں چوک دیپالپور برانچ میں تھا تو میں نے بی اے کر لیا ابا جی بڑے خوش تھے اسی برانچ سے میری پرموشن بطور افسر ہو گی تب میں تیئس چوبیس سال کا تھا پہلے مجھے تاندلیانوالہ برانچ بھیجا گیا پھر ٹریننگ پر اور پھر ابا جی کے رسوخ سے میرا تبادلہ اوکاڑہ ہو گیا۔ ابا جی جتنے جلالی تھے اتنے ہی گھریلو معاملات میں سیدھے سادے بھی تھے۔

میں نے اور اشرف نے امی کے مشورے سے فریج خرید لی پیسے کم تھے ہم نے ادھر ادھر سے پیسے پکڑ کر فریج تو لے لی مگر سات

آٹھ ہزار ادھار چڑھ گیا امی کو تیار کیا امی نے والد صاحب سے کہا کہ اشرف کا دوست کسٹم میں ہے یہ نئی فریج اس کی ہے صرف آٹھ ہزار کی دے رہا ہے ہمسائے اس کا دس ہزار دے رہے ہیں ساتھ ہی میں نے سب سے چھوٹے بھائی کو جانپڑ رسید کر دیا تیرا منہ ہے فریج کا پانی پینے والا ابا جی نے مجھے تگڑی موٹی گالی دی اور ساتھ ہی گھڑی سے چیک بک نکال کر آٹھ ہزار کا چیک دیا اور کہا یہ فریج ابھی لو ہمایوں شہزاد اس کا پانی پیے گا ہمایوں میری جان سب سے چھوٹا بھائی جو ایک ایکسیڈنٹ میں جوانی میں زندگی سے ہاتھ دو بیٹھا اسی طرح ابا جی سے۔ میں نلکے کی جگہ پانی والی موٹر واشنگ مشین ڈرائر اور اے سی خریدے۔ ابا جی کفایت شعار تھے ایسی اشیاء کو ضرورت نہیں سامان تعیش خیال کرتے تھے انھوں نے اپنی بچت سے ظفر کالونی میں ایک پلاٹ خریدا اور اس پر گھر بنایا کیونکہ پرانا گھر بہت چھوٹا اور کنبے کے لیے ناکافی تھا گھر بدلتے وقت ہم سب بہت خوش تھے سوائے ابا جی کے کیونکہ انھیں اپنی والدہ اور بہن بھائیوں کو چھوڑنے کا قلق تھا ابا جی دادی کے کہنے پر بہت دن بعد نئے گھر میں آئے۔ اسی گھر میں اشرف کی انجینئرنگ کی ڈگری ہوئی ارشد کا سب انجینئر کا ڈپلومہ ہوا اور چھوٹی بہن استانی بن گئی اس میں یقیناً امی اور ابا جی کی محنت کا بہت دخل تھا پہلے ارشد کا محکمہ نہر میں دیپالپور تقرر ہوا اشرف ضلع کونسل اوکاڑہ میں ڈسٹرکٹ انجینئر ہو گیا اور بہن کی تقرری بھی کسی نواحی گاؤں میں ہو گی۔

تب میری شادی کی بات چل نکلی بات پکی ہو گئی ساہیوال فرید ٹاؤن خاندان کی لڑکیاں بارات کے لیے تیار ہو رہی تھیں ابا جی نے کہا کہ میں نے کہہ دیا ہے بارات کے ساتھ نہ کوئی لڑکی جائے گی نہ آئے گی سناٹا چھا گیا تو میں نے ہولے سے عرض کیا جی آنے والی بات پر ذرا نظر ثانی فرمائیں ابا جی نے جملے کی معنویت پر لمحہ بھر غور کیا پھر کہا الو دا پٹھا۔

میرا چھوٹا بھائی ندیم ان دنوں میں پڑھائی میں ذرا دلچسپی نہ لیتا نتیجہ کار اسے موٹر سائیکلوں کے کام پر ڈال دیا وہ بھی جانے لگ گیا مگر امی کو کسی پل قرار نہیں تھا ایک دو دفعہ ابا سے کہا اسے سکول داخل کراؤ مگر ابا جی نے تساہل برتا والدہ خود سکول پہنچ گئیں تو ابا جی کو ندیم کو دوبارہ داخل کروانا پڑا بعد میں ندیم نے پیچھے مڑ کر نہیں دیکھا آج کل اس کا انگریزی اور اردو ادب میں معتبر نام ہے۔

شادی میرے لیے نیک شگون ثابت ہوئی مجھے منیجر لگا دیا گیا ابا جی بہت خوش تھے ایک دن مجھے فون کیا میں نے عرض کیا جی حبیب

بینک تو کہنے لگے الو دیا پٹھیا تو اپنے پیونو نہیں پہچانتا میں نے ہنس کر کہا جی اب پہچان لیا اے بانوے میں ابا جی ریٹائر ہوے تو پھر ہم بھائیوں کے دفتری مسائل حل کرنے میں لگے رہے کبھی مشکلات بھی آتیں مگر وہ ہمیشہ سرخرو رہے۔ انھیں دنوں میں غلا منڈی برانچ کا منیجر تھا۔

وہ برانچ بورڈ اور یونیورسٹی کو ڈیل کرتی تھی پنجابی کے خوب صورت شاعر ارشد علی ارشد ہر سال کسی نہ کسی ایم اے کا امتحان دیتے مجھے کہنے لگے تم بھی کرو تمہیں شرم نہیں آتی اردو کے شاعر ہو کر ایم اے اردو نہیں کرتے پانچ سو داخلہ تھا بھجوا دیا بینک سے چھٹی نہیں مل رہی تھی سیکنڈ ٹائم پیپر تھے انتظامیہ نے یہ لچک دی کے برانچ سے جا کر پیپر دو اور پھر برانچ میں آ جاؤ میں نے سوچا اسکپ کر دیتا ہوں مگر اہلیہ نے ابا جی کو بتا دیا کہ اس نے داخلہ بھیجا ہے اور اب امتحان نہیں دے رہا میری پیشی ابا جی کے حضور ہوئی اور مجھے ایم اے اردو کرتے بنی۔ ان کا ایک بھائی اوباش تھا نشہ وغیرہ کرتا جوا بھی کھیلتا تھا نے کچہری بھی آنا جانا لگا رہتا ہم سب بھائی اس سے اجتناب کرتے مگر اس کی عادات کو ناپسند کرنے کے باوجود ہر مشکل میں اس کے ساتھ کھڑے ہوتے ان کی زندگی میں ہم تین بھائیوں کی اولاد ہوئی ہمارے ساتھ اکثر کفایت شعاری کیا کنجوسی کرتے مگر پوتوں پوتیوں کو بوتل بسکٹ فوری لے کر دیتے ایک دفعہ میری اہلیہ نے امی کی مشاورت سے بیٹے کو تھپڑ جڑ دیا ابا جی نے ڈانٹا تو کہنے لگی کسی مہنگے بسکٹ کا نام لے کر یہ مانگ رہا ہے کہاں سے لے کر دوں ابا جی نے پوتا کو فوراً اٹھایا اور دکان سے بسکٹ کا ڈبہ لے کر دیا اشرف ڈسٹرکٹ انجینئر اوکاڑہ میں ہی تھا اسے بڑا سرکاری گھر ملا میں بچوں سمیت وہاں شفٹ ہو گیا کسی سیمینار پر اوکاڑہ سے باہر جانا پڑتا تو ابا جی بچوں کے پاس آ کر رہے کوئی فروٹ وغیرہ منگواتے تو ہمارا حصہ ضرور رکھتے میں نے گورنمنٹ کالونی میں ایک کنال کا پلاٹ لیا بڑے خوش ہوئے اس کا نقشہ وغیرہ خود پاس کروایا تعمیر کی پہلی اینٹ میں نے دادی سے رکھوائی تو بہت خوش ہوئے ہم تین بھائیوں اور دو بہنوں کی شادی زندگی میں کر دی ہمارے بچوں کا اندراج تک نادرا اور میونسپل کمیٹی میں خود کروایا۔

ندیم کی بطور ایس ایس ٹی تقرری پر خوش ہوئے کلیم کو محکمہ تعلیم ایڈجسٹ کروایا اکلوتے بھانجے کو کلیم سے بھی پہلے لگوایا بہن کی وجہ سے بیٹی کا رشتہ دیا اپنی والدہ کا بہت خیال رکھتے ان کا حکم نہ ٹالتے دادی چودہ اگست 1997 کو خالق حقیقی سے جا ملیں ابا جی کو چپ لگ گی دن رات

قرآن پاک پڑھتے اور اپنی والدہ کو بخشتے۔
زندگی بھر ابا جی نے سب کا خیال رکھا ماں باپ بہن بھائی اولاد بیوی اگر نہیں رکھا تو اپنا خیال نہیں رکھا بیمار تھے مگر ڈاکٹر کے پاس ہرگز نہ جاتے۔
دال ماش ساگ گوبھی گوشت بہت پسند تھے آخری دنوں روٹی چھوڑ دی میں نے عرض کیا ابا جی تھوڑا بہت کھالیں کہنے لگے یار جی نہیں چاہتا ورنہ میں اور گوبھی گوشت چھوڑ دوں۔ مرنے سے پہلے شام کے وقت میرے چھوٹے بھائی کلیم سے کہا جاؤ مسعود کے بچوں کو پڑھاؤ تمھاری نسل ہیں میں نے پھر منت سماجت کی ابا جی لاہور کسی ڈاکٹر کے پاس چلتے ہیں مگر کہنے لگے یار تمھارے بھی چھوٹے چھوٹے بچے ہیں یہ بات مجھے اندر سے آج تک چیرتی ہے 23 جنوری 1998 کو طبیعت شدید خراب ہوئی ہم بھائی ہسپتال لے گئے وہاں ڈاکٹر صاحبان نے کہا شدید ہارٹ اٹیک ہے لاہور لے جائیں ابا جی نے مجھے کہا جاؤ یار بچوں کے پاس اشرف نے ایمبولینس منگوائی لاہور لے گئے لاہور ہسپتال میں ڈاکٹروں نے ابا جی کو مردہ قرار دے دیا اور صبح فجر کے وقت وہی ایمبولینس ابا جی کا جسد خاکی لے کر ہمارے دروازے پر کھڑی تھی۔
بے شک وہ دنیا میں نہیں مگر ہمارے دلوں میں دھڑکتے ہیں۔
ابا جی عمر بھر یہی سمجھتے رہے یہ نالائق میرے بغیر زندگی گزارنے کے لائق نہیں وہ ٹھیک ہی کہہ رہے تھے ہم نے ابا جی کے بغیر زندگی کیا گزارنی ہے بلکہ زندگی ہمیں گزار رہی ہے حق مغفرت فرمائے۔

میں اگلے پچھلے زمانوں سے ہو کے آیا ہو
مجھے کہیں ترا نعم البدل نہیں ملتا

.....

سر سے پاؤں تک منشور محبت کا
باپ ہو جیسے کوہ طور محبت کا
شفقت اس کے اجزائے ترکیبی ہیں
رگ رگ میں ہو جیسے نور محبت کا
باپ وہ جس کے کوزے جیسے سینے میں
ایک سمندر ہے معمور محبت کا
گھر کی خاطر ہر قربانی دیتا ہے
باپ ہمیشہ سے مزدور محبت کا
آدمی زاد زمین پہ جب سے آیا ہے
پھونک رہا ہے تب سے صور محبت کا
اٹھتا ہے جب ہاتھ وہ سر سے شفقت کا
ہو جاتا ہے دریا دور محبت کا
لمحہ لمحہ ساری عمر یتیمی میں
جیسے شیشہ چکنا چور محبت کا
ازلوں سے مسعود تجوری چاہت کی
باپ خزانہ ہے بھرپور محبت کا

☆☆☆☆☆

''عکس مہرباں ہوئے'' پر اجمالی نظر

اُردو اور پنجابی زبان کے معروف شاعر، نقاد اور نثر نگار اخلاق عاطف نے آج سے کچھ عرصہ پہلے اپنی تازہ تصنیف ''عکس مہرباں ہوئے'' فراہم کی اور ساتھ ہی انھوں نے اس پر کچھ لکھنے کو کہا۔ کچھ دنوں تک یہ کتاب میری مطالعہ کی میز پر پڑی رہی لیکن اس کی بیرونی جاذبیت نے مجھے بہت عرصہ تک اس سے دور نہیں رہنے دیا۔ چناں چہ میں نے ایک دن اسے میز سے اُٹھایا اور اپنے ذہن کے تمام دریچے کھول کر اسے پڑھنا شروع کر دیا تو جیسے جیسے میں اس کے صفحات پر بکھرے اشعار کی اُنگلی پکڑ کر آگے بڑھتا گیا تو میں نے دیکھا کہ یہاں تو معنی اور مفہوم کی کئی بستیاں آباد ہیں اور ہر بستی کے اپنی ایک الگ پہچان ہے۔ اگر ایک بستی کے اندر سے مصائب و آلام کا دھواں اُٹھتا ہوا محسوس ہوتا تو دوسری بستی سے پیار و محبت اور بھائی چارے کی بانسری کے سُر کانوں میں رس گھولتے دکھائی دیتے اور کہیں پر بغض، دھوکہ دہی اور حکمرانوں کی چیرہ دستیوں سے واسطہ پڑتا ہے۔ چوں کہ اخلاق عاطف اسی معاشرے کا حصہ ہیں جہاں یہ سب کچھ ہو رہا ہے تو پھر یہ کیسے ممکن ہے کہ وہ ان عوامل سے چشم پوشی کرتے ہوئے اشعار تخلیق کرتے وقت ان سے دور رہتے۔ یہ اشعار دیکھیے:

ممنون تھا وہاں فقط اظہارِ آرزو
پائے مگر یہاں سبھی بردہ فروش لوگ

.....

ہمیں درخت کے گرنے کا دُکھ ہی کم تو نہ تھا
لہولہان ہوئے ہیں بہت پرندے بھی

حنیف باوا

ضبط ایسا ہے کہ رویا بھی نہیں جا سکتا
درد ایسا ہے کہ سویا بھی نہیں جا سکتا

.....

اخلاق عاطف جب ایسے اذیت ناک ماحول سے دل برداشتہ ہو جاتے ہیں تو ایسی رومان پرور فضا میں آ جاتے ہیں جو آس اور آس کے منتظر قاری کو راحت کا سامان مہیا کرتے ہیں۔

ساری عمر اسی کا نشہ رہتا ہے
پہلے پیار میں وکھری لذت ہوتی ہے

.....

تم سے اک لٹ بھی سنبھالی نہیں جاتی اپنی
حُسن والے تو زمانے کو سنوار آتے ہیں

.....

اگر تو روبرو ہوتا نہیں ہے
تو ہم خود سے بھی چھپ کر بیٹھتے ہیں

.....

یہاں تو غیر بھی بیٹھے ہوئے ہیں
ذرا کچھ دور چل کر بیٹھتے ہیں

.....

جب اس کا قلم اس رومان پرور فضا سے نکل کر سیاست کی وادی پر خار میں قدم رکھتا ہے تو اس کی نوک سے ایسے چبھتے ہوئے اشعار برآمد ہوتے ہیں جو قاری کے سامنے لمحہ موجود کی سیاست کی سب کرشمہ سازیاں کھول کر رکھ دیتے ہیں۔

اشعار دیکھیے:

ان مسیحاؤں کے پہلے بھی بہت دیکھے ہیں
معجزے اور کرامات خدا خیر کرے

.....

کیا خبر ہم کو پریشاں رکھیں گی کب تک
آمریت کی مہمات خدا خیر کرے

.....

ہر آسائش لکھ دی اس نے زرداروں کے بچوں کے نام
میری بیٹی کی قسمت میں بوسیدہ جزدان لکھا

.....

ہے جبر و اختیار کی یہ حد کہ ہر طرف
ہیں شور بے پناہ کے قیدی، خموش لوگ

.....

آخر میں صرف اتنا عرض کروں گا کہ اخلاق عاطف کی اس خوبصورت کتاب کے تمام اشعار سہل ممتنع کی عمدہ مثالیں ہیں لیکن اس کا مطلب یہ بھی نہیں کہ یہ اشعار قاری کے ذہن کو جھنجھوڑ کر اسے ان میں ڈوب جانے پر اُکساتے نہیں۔ کہا جاتا ہے کہ آسان پیکر شعر میں سطحیت ہوتی ہے ہو سکتا ہے کہ کہیں کہیں یہ بات سچ پر مبنی بھی ہو لیکن ''عکس مہرباں ہوئے'' میں یہ بات قطعاً نہیں ہے۔

☆☆☆☆☆

مشرف مبشر کی تخلیقی دنیا

افسانہ یا کہانی لکھنا ایک فن ہے۔۔اس شعبے میں درجہء کمال حاصل کرنے میں عمریں لگ جاتی ہیں۔ایک اچھے تخلیق کار کو اپنی کاوش کو بہتر انداز میں پیش کرنے کے لئے خیال آفرینی، بہترین لفظوں کے انتخاب اور زبان و بیان پر حتی الامکان دسترس حاصل کرنا ہوتی ہے۔ہمارے اردگرد بہت سی کہانیاں بکھری پڑی ہیں، جو ایک تخلیق کار کے قلم سے جنم لے کر شاہکار کے درجے تک پہنچتی ہیں۔افسانے علامتی بھی ہوتے ہیں اور سیدھے سادھے بیانیہ انداز میں بھی لکھے جاتے ہیں۔اس تناظر میں اگر محترمہ مشرف مبشر کی کتاب، برکھا کی بدلی کو دیکھا جائے تو ہمیں ان میں سادگی، روانی اور بے ساختگی کے علاوہ بات کو براہ راست کہنے کا ہنر نظر آتا ہے۔وہ افسانے میں علامتی انداز نہیں اپناتیں بلکہ زندگی کے بڑے بڑے مسائل کو انتہائی سادگی اور خوبصورتی سے قارئین کے سامنے میں پیش کر دیتی ہیں۔یوں ان کی تحریروں میں عام قاری بھرپور دلچسپی لیتا ہے اور وہ بڑے سبھاؤ کے ساتھ لکھتی چلی جاتی ہیں۔بقول ڈاکٹر رشید امجد، 'برکھا کی رت' مشرف مبشر کا پہلا افسانوی مجموعہ ہے۔افسانے کی دنیا میں انھوں نے پہلا قدم بیانیہ انداز میں رکھا ہے۔چھوٹے چھوٹے تجربے، ننھے منے جذبے اور سوتے جاگتے لمحے ان کہانیوں کی اساس ہیں۔''

گیارہ افسانوں پر مشتمل اس کتاب میں مصنفہ زیادہ تر خواتین کی زندگی کے نشیب و فراز کا احاطہ کیا ہے۔مصنفہ کی تخلیقی ہنرمندی ان کے ہر افسانے میں جھلکتی ہے۔وہ اپنی ہر تحریر کا آغاز اور اختتام خوب صورتی اور چابکدستی سے تحریر کرنے پر قادر ہیں۔انھیں یہ ہنر عطائے خداوندی سے ملا ہے۔اپنے

محمد نوید مرزا

بارے میں لکھتے ہوئے فرماتی ہیں،،
میں نے سکول کی کلاسوں میں ہی تمام خواتین کو پڑھ لیا تھا۔ سجاد حیدر، نیاز فتح پوری، ایم اسلم، حجاب امتیاز علی، عصمت چغتائی، قرۃ العین حیدر کی کتابیں بہت اچھی لگتی تھیں،،
مزید لکھتی ہیں --- بانو قدسیہ اور اشفاق احمد کی تحریروں کا مطالعہ کرتے وقت محبت بھی ملتی ہے۔ انسانی نفسیات کی پرتیں بھی کھلتی جاتی ہیں اور فلسفیانہ سوچیں بھی ابھرتی ہیں،،
میرے خیال میں مشرف صاحبہ نے خواتین کے مسائل کی عظیم ترجمان رضیہ بٹ کا مطالعہ بھی کیا ہوگا۔ رضیہ بٹ عورت کے دکھوں سے آشنا تھیں۔ ان کے قلم میں بلا کی روانی تھی۔ مشرف صاحبہ کی شاید پشاور میں رہتے ہوئے ان سے ملاقات بھی ہوئی ہوگی۔ رضیہ صاحبہ ایک طویل عرصہ پشاور رہی ہیں۔ مشرف صاحبہ بھی رضیہ بٹ کی طرح خواتین کے مسائل سے آگاہ ہیں۔ ان کا برق رفتار قلم گھروں کی چھوٹی چھوٹی رنجشوں، غموں اور خوشیوں کی بیک وقت ترجمانی کرتا ہے۔ جس کے لیے وہ مبارکباد کی مستحق ہیں۔
افسانوی کی اس کتاب کے علاوہ ان کی شاعری کی کتاب، تاریک اجالے اور سفر ناموں کی کتابیں ولایت چلتے ہیں، بوستان ایران، اور ویلز دلآویز بھی منظر عام پر آچکی ہیں۔ زیر نظر کتاب، ولایت چلتے ہیں۔ ان کا شاندار اسلوب میں لکھا گیا سفرنامہ ہے۔ کتاب کا انتساب امیر شہر کے غریبوں کے نام ہے۔ کتاب میں مختلف عنوانات کے تحت تحریریں شامل کی گئی ہیں، جن کو پڑھ کر قاری خود کو ولایت میں گھومتا ہوا محسوس کرتا ہے۔ مصنفہ نے سفرنامہ نگاری میں بھی اپنی تحریر کی خوبصورتی اور مہارت سے قاری کو اپنے سحر میں جکڑے رکھا ہے۔ بقول جناب نثار ترابی، مشرف مبشر صاحبہ ایک اسم با مسمی سفرنامہ نگار ہیں، یوں کہ جس طرح ان کے نام میں غنائی کیفیت بسی ہوئی ہے اسی طرح ان کے نغمہ بار اسلوب میں ایرانی ثقافت کی کلاسیکی اور مذہبی مطالعاتی جھلک اور گوروں کے دیس کی آگہی کا فیضان رچا بسا ہے،،
نثار ترابی صاحب کی یہ سطریں محترمہ کو بھرپور خراج تحسین ہے۔ میں اپنی طرف سے بھی مشرف مبشر صاحبہ کی علمی و ادبی کاوشوں پر انھیں بھرپور مبارک باد پیش کرتا ہوں --- بہت سی دعائیں

☆☆☆☆☆

اُردو ادب کی دل دادہ......مہ جبیں

ریاض ندیم نیازی

خواتین اہلِ قلم میں اکثر خواتین ایک ہی صنفِ سخن کو اپناتی ہے......نثر یا نظم، بہت کم خواتین اہلِ قلم ایسی ہوتی ہیں جو شاعرہ ہونے کے ساتھ ساتھ افسانہ و ناول نگار بھی ہوتی ہیں، جیسے رضیہ فصیح احمد اور ڈاکٹر فاطمہ حسن وغیرہ۔ یہ دونوں شاعرہ بھی اچھی ہیں اور افسانہ نگار بھی۔ اگر آج کے اُردو ادب کی تازہ صورت حال پر نظر ڈالی جائے اور اُردو ادب کا پس منظر ملاحظہ کیا جائے تو برجستہ ایک بہترین شاعرہ اور افسانہ نام نگار مہ جبیں کا نام سامنے آتا ہے جنھوں نے بیک وقت شاعری بھی کی ہے اور نثر نگاری بھی۔

شاعری میں اُنھوں نے نظم و غزل کے ساتھ ساتھ دیگر اصنافِ سخن میں بھی طبع آزمائی کی ہے اور نثر نگاری میں اُنھوں نے افسانے اور ناول بھی لکھے ہیں۔ مہ جبیں صاحبہ نے نہ صرف اِن اصنافِ نظم و نثر میں کارہائے نمایاں سرانجام دیے ہیں بلکہ اُن کی یہ تمام نگارشات و تخلیقات کتابی اشکال میں بھی زیورِ طباعت سے آراستہ ہو کر منصۂ شہود پر آچکی ہیں۔ مہ جبیں صاحبہ کی چھ مندرجہ ذیل کتابیں اشاعتی مراحل سے گزر کر قارئین و ناقدین و مشاہیر سے داد و تحسین بھی وصول کرچکی ہیں:

۱۔ خاموشی میری ذات میں ہے (شاعری)

۲۔ عشوہ ساز (شاعری)

۳۔ ستارے رقص کرتے ہیں (شاعری)

۴۔ آبشارِ زیست (افسانے)

۵۔ اُٹھے جو ہاتھ دعا کے لیے (ناول)

۶۔ آبلہ پا (ناول)

محترمہ مہ جبیں کی شاعری میں نسوانی لہجہ اُن کی پہچان ہے۔ وہ عورت کے معاملات کو

اپنی شاعری میں زیادہ زیرِ بحث لاتی ہیں اور کھل کر بات کرتی ہیں۔ اُن کو گول مول بات کرنے یا غیر واضح انداز اختیار کرنے کی عادت نہیں ہے، بلکہ وہ دوٹوک اور To The Point بات کرتی ہیں۔ اُردو شاعری میں وہی شعرائے کرام زندہ رہے ہیں جنھوں نے مقصد کی بات کی ہے اور اختصار کو اپنایا ہے۔ مہ جبیں کی شاعری بھی اختصار کا عمدہ نمونہ ہے جس میں کم سے کم الفاظ میں زیادہ سے زیادہ بات کہہ دینے کا عنصر نظر آتا ہے، اِسی خصوصیات نے مہ جبیں کی شاعری کو قابلِ توجہ بنا دیا ہے، اِسی لیے اُن کی شاعری ہر قسم کی تعلیمی قابلیت اور ذہنی استعداد رکھنے والے قارئین کی توجہ اپنی جانب مبذول کرانے میں کام یاب رہی ہے۔

مہ جبیں کی غزل کی سب سے بڑی خاصیت یہ ہے کہ اِس میں ماضی، حال اور مستقبل اپنی تمام تر رعنائیوں کے ساتھ جمع ہو گئے ہیں۔ وہ ماضی کی یادوں کو بھی اپنے اشعار میں جگہ دیتی ہیں اور امروز کی باتیں بھی کرتی ہیں اور فردا کے امکانات بھی اُن کی شاعری میں بڑے روشن چراغ سے جلتے نظر آتے ہیں۔ وہ بہت ہی عمدگی اور متاثر کن انداز سے ماضی، حال اور مستقبل کے عناصر کو الفاظ کے سہارے قرطاس پر ایسے پینٹ کرتی ہیں کہ ایک دل کش اور دیدہ زیب پیکر تراشا جاتا ہے جو دیکھنے والوں کی آنکھوں کو خیرہ کر دیتا ہے۔ اُن کی غزلوں میں انسان کے چلتے پھرتے پیکر دکھائی دیتے ہیں، یہی اُن کی شاعری کی سب سے بڑی خوبی ہے۔

اُن کے افسانے انسان کے دل پر گہرے نقوش چھوڑ جاتے ہیں اور قارئین کو کوئی نہ کوئی سبق دے جاتے ہیں۔ وہ اپنے افسانوں میں رائی کو پہاڑ بنانے کے ہنر سے اچھی طرح واقف ہیں۔ وہ ایک باریک سے نقطے کو بیان کرنا چاہتی ہے تو افسانے لکھتی ہیں اور کسی بڑے خاندان کی منظر کشی کرنا مقصود ہو تو ناول بُننا شروع کر دیتی ہیں۔ اُن کی نثر ہو یا نظم، ہر دو لحاظ سے قابلِ ذکر اور مطالعے کے قابل ہوتی ہے۔ مجھے اُن سے بہت سی اُمیدیں وابستہ ہو گئی ہیں۔ اگر وہ اِسی طرح دل جمعی، لگن و جستجو اور ذوق و شوق سے ادب تخلیق کرتی رہیں تو ایک دن اُن کا نام صفِ اوّل کی شاعرات اور ادیباؤں میں ہوگا اِن شاءاللہ۔

☆☆☆☆☆

نصرت نسیم

نصرت نسیم مشرقی تہذیب وثقافت سے جُڑی ہوئی وہ خاتون ہیں جن کا دامن حمد وثنا، درود و سلام، نادِ علی، حُبِ اہلِ بیت اطہار، عقیدتِ اولیائے کرام اور پُرخلوص دعاؤں کے روشن جگنوؤں سے بھرا پڑا ہے۔

جب وُہ قلم بدست ہوتی ہیں تو اُن کے لبوں پر دعاؤں کے پھول کِھلتے ہیں اور ان کی رگوں میں خلوص کا لہو گردش کرتا ہے۔ جہاں وُہ اپنی تحریروں میں دعاؤں کے موتی کوٹ کوٹ کر بھر دیتی ہیں، وہاں جب کسی سے مِلتی ہیں تو تو اُسے بھی حصارِ دعا میں لے لیتی ہیں۔

نہ جانے کس نے کتوں کو مخاطب کر کے کہا تھا:

''دیکھو، آدمی تمہاری سطح سے نیچے، بہت نیچے گر چکے ہیں۔''

نصرت نسیم آدم زادوں کو انسانیت کی سطح پر بحال کرنا چاہتی ہیں اور اپنی خوش خُلقی سے محبت کے نیلے پھول کِھلاتی رہتی ہیں۔

وُہ جانتی ہیں کہ نیکی کی ایک چھوٹی سی کرن اندھیرے کی دیوار میں دراڑ ڈال دیتی ہے اور مثبت محسوسات سے رسیلے چشمے پھوٹنے لگتے ہیں۔ اِس لئے وُہ شکوۂ ظلمتِ شب کے بجائے اپنے حصے کی شمع جلاتی رہتی ہیں۔

نسیم نصرت کا تعلق اُس قبیلے سے نہیں ہے جو احباب کو اچھے موسم پر خوش ہوتا دیکھیں تو کہیں ''اچھے موسم کب تک، بھائی!'' وُہ خود کو اُن خوش بختوں کی صف میں شامل رکھنے کی خواہش مند ہیں جو مقام صبر کو مقام شُکر میں بدل دیتے ہیں۔

ہر انسان کی زندگی میں جہاں سُکھ کے سویرے مِلتے ہیں، وہاں دُکھ کے اندھیرے بھی راہ پاتے ہیں۔ نیک بخت لوگ سُکھ کی نعمت کا تحفظ شُکر سے کرتے ہیں اور دکھ کی زحمت کا صبر سے۔ نصرت نسیم بھی کڑے امتحانات سے گزرتی رہی ہیں لیکن ان کے صبر وشکر کے ذخیرے ہر سے ان کے ساتھ رہے ہیں اور انہوں نے محبت و مودّت کا دامن کبھی ہاتھ سے جانے نہیں دیا۔

بارہا تُند ہوائیں چلیں، طوفاں آئے
لیکن اک پھول سے چمٹی ہوئی تتلی نہ گری

مجید امجد

شجاعت علی راہی

مولا علی علیہ السلام نے فرمایا تھا:
خدا کا یہ کام نہیں کہ کسی کے لئے شکر کا دروازہ کھول دے اور نعمت میں زیادتی کا دروازہ بند کر دے۔

اس سے یہ استنباط کیا جا سکتا ہے کہ نصرت نسیم دنیا و عاقبت کی نعمتوں سے محروم نہیں رہ سکتیں اور اس کا ایک عکس ان کتابوں میں ملتا ہے جو انہوں نے پچھلے چند برسوں میں تحریر کی ہیں۔

اپنی مٹی سے نصرت نسیم کا رشتہ بہت پائیدار ہے۔ انھوں نے اپنے شہر کوہاٹ اور صوبے پختون خوا کی جو ثقافتی سفارت کاری اور لفظی مینا کاری کی ہے، وہ دیدنی اور شنیدنی ہے۔ ان کی تحریروں میں ثقافتی رس ہے اور ماورائی چاشنی ہے۔ وہ لفظوں کی حرمت کا پاس رکھتی ہیں۔ لکھتی کم ہیں، زاویہ زیادہ اکٹھا کرتی ہیں۔

انہیں پڑھیے تو ناصر کاظمی کے اشعار ذہن میں گونجنے لگتے ہیں:

میں نے جب لکھنا سیکھا تھا
پہلے تیرا نام لکھا تھا
بوٹا بوٹا نور کا زینہ
سایہ سایہ راہ نما تھا
جو پایا وہ بھی تیرا ہے
جو کھویا وہ بھی تیرا تھا
شاخیں تھیں یا محرابیں تھیں
پتا پتا دستِ دعا تھا۔

اس جملے پر اپنی گفت گو کو لپیٹنا چاہوں گا کہ جس معاشرے میں نصرت نسیم جیسی دعا گو ہستیوں کی تعداد بڑھ جائے، اُس معاشرے میں اجتماعی روحانی قوت کی روشنی پھیلنے کے امکانات بڑھ جاتے ہیں۔

☆☆☆☆☆

محترمہ نصرت نسیم اور جناب شجاعت علی راہی

آسمان ادب کا ایک چمکتا ستارا

زندگی ایک سفر ہے۔ اس سفر میں بہت سے لوگ ملتے اور بچھڑ جاتے ہیں۔ راقم بھی اسی دُنیا کا ایک باسی ہے۔ بے شمار چہرے ملے، کچھ وقت تک ساتھ رہے، پھر اپنی اپنی راہ پہ ہو لیے۔ بہت سے لوگ ایسے کہ منہ پھیر کر گئے تو دیکھا تک نہیں، جبکہ چند ایک نے اس دل میں ٹھکانے بنا لیے اور یوں دُواب بھی ساتھ ساتھ ہیں۔ قریباً سولہ برس ہوئے عذرا اصغر صاحبہ سے اچانک ایک ٹیلی فونک ملاقات ہوئی۔ خیر سگالی کے جذبات کا تبادلہ ہُوا، پھر وہ وقت کا اور وہ ملاقات آج بھی حرزِ جاں بنی ہوئی ہے۔ یہ محترمہ کی بڑائی ہے کہ مجھ کم ترین کو اہمیت بخشی اور آج بھی ایک جان فزا لنک کی ڈوری تھامے ہوئے ہیں۔

عذرا اصغر سب کا جانا بوجھا نام اور سب سے اُن کی جان پہچان۔ تحریر ہی ان کی وجہِ شہرت ہے۔ سبھی جانتے ہیں کہ وہ کتاب شناس، کتاب دوست اور کتاب پرور ہیں اور یہ بھی کہ وہ ایک قابلِ رشک تحریری سرمائے کی مالک ہیں۔ لیکن ایک اہم بات جو ہر کوئی نہیں جانتا، یہ ہے کہ عذرا اصغر افسانہ نگار ہونے کے علاوہ قدرتی حُسن کی پرستار بھی ہیں۔ پھول ان کی دلی چاہت ہے۔ کتاب کو بھی کِھلے پھول کی طرح سمجھتی اور خوب سنبھالتی ہیں۔ وہ قلم بدست ہونے کے ساتھ ساتھ کھلکھلاتا گل بھی دسترس میں رکھتی ہیں۔ ایک عہد آشنا ہستی کہ جس کی شخصیت اور تحریر دونوں مشکبار اور پُرکشش ہے۔ دونوں کو پڑھئے، آپ کو یکساں خوب صورتی ملے گی، خلوص، جذبۂ دل کی سچائی اور چھلکتی چاہت کی مہک ملے گی، خواہ سامنے آدمی ہو یا پیارے وطن کا ذکر۔

عذرا اصغر دُنیائے ادب کا ایک معتبر و منور نام ہے۔ ان کی کتاب زندگی کو کھولئے تو کئی ابواب سامنے آتے ہیں جو اُن کی ڈھکی چھپی ذات کے اکثر پہلوؤں کو اُجاگر کرتے ہیں۔ با اخلاق، ہنس مکھ، نرم دل گفتگو، ملنسار اور محفل آرا۔ راقم نے موصوفہ کے اکثر افسانوں اور کتابوں کو پڑھا ہے۔ گاہے گاہے اُن سے ٹیلی فونک بات چیت رہتی ہے۔ ان کی کتابوں پر آرا لکھنے کا اعزاز بھی پایا ہے۔ شہرت سے زیادہ تسکین قلبی اُن

محمد طارق علی

کے پیش نظر رہتی ہے۔ حقیقت نگاری ان کا اولین اصول ہے۔ قوت مشاہدہ خوب ہے، وقت کی دھڑکتی ساعتوں کو جانتی و پہچانتی ہیں۔ جب لکھتی ہیں تو زندگی کے قریباً سبھی گوشوں کو مدنظر رکھتی ہیں۔

آج عذرا اصغر کو لکھتے لکھتے قریباً پینسٹھ برس بیت گئے۔ وقت نے بہت سی کروٹیں لیں، ان کا دل ڈگمگایا نہ قلم، تھکاوٹ کا احساس یا اکتاہٹ بھی نہیں۔ جانے کتنے افسانے اور چند ناولٹ، ناول ان کے علاوہ شخصی خاکے، مضامین، پرنٹ/ای میڈیا کے لیے لکھے گئے کالم ان کے کریڈٹ پر ہیں۔ انھوں نے خاصے عرصہ تک ادبی صحافت بھی کی ہے۔ (مدیرہ ماہ نامہ ''تخلیق'' لاہور اور ''تجدید نو'' اسلام آباد) سو اُن کا ادبی کردار افسانہ نگاری ہی نہیں بلکہ کئی اور تحریری و تخلیقی موضوعات اور جہتوں کو کور کرتا ہے۔ اُن تھک ادب نگاری سے ان کا تخلیقی وفور ظاہر ہوتا ہے۔ تاہم زود نویسی کے باوجود انہیں اپنے قلم کی حرمت اور پندار کا احساس ہمہ وقت رہتا ہے۔

عذرا اصغر کسی بھی ادبی گروپ، تحریک یا انجمن سے تعلق نہیں رکھتیں۔ ان کی اصل پہچان یہ ہے کہ کسی ادب نواز خانوادے سے اُن کا سرے سے تعلق نہیں۔ ان کی ادب نگاری کی تاریخ شروع ہوتی ہے گھر سے۔ وہی 1947 کی تقسیم کے بعد پاکستان ہجرت والا گھر، جہاں انھوں نے ہوش سنبھالا اور تعلیمی مدارج طے کیے۔ بعض ادبی رسالے بھی پڑھنے کو ملے۔ شعور پروان چڑھا تو افسانہ نگاری سے دلچسپی پیدا ہوئی۔ چند گھریلو پابندیوں کا سامنا، تاہم ان رکاوٹوں سے گزر کر ان کی نگارشات صفحۂ قرطاس پر اُترنے اور مختلف ادبی جرائد میں چھپنے لگیں۔ اس ابتدائی دور کی کامیابی کے بعد اُنھوں نے پیچھے مُڑ کر نہیں دیکھا۔ شادی کے بعد کا دور تو بہت ہی باسہولت ثابت ہُوا۔ راہوار قلم کو مہمیز ملی، وہ چلتا گیا اور ادبی منازل طے ہوتی رہیں۔

یہاں یہ ایک عمومی لیکن دراصل جینوئن سا سوال اُٹھتا ہے کہ پہلی سے پیدا ہونے والی عورت کو سمجھنا ایک مشکل کام ہے۔ اسے کوئی بھی ادب نگار آسان نہیں لیتا۔ عذرا اصغر نے اسی موضوع کو کیوں اپنایا اور کیسے کامیابی سے برتا۔ اس کا جواب ان سے اور ان کی تحاریر سے ملتا ہے۔ یہ موضوع ان کی اپنی چوائس کا ہے کہ ان کی طبیعت اور ذات سے میل کھاتا ہے۔ زیادہ سوچنا یا دُور کی کوڑی لانی نہیں پڑتی۔ نئے نئے تجربات زندگی سے بھی واسطہ پڑا۔ سو، عذرا اصغر وہ ہستی ہے کہ جس نے اپنی ابتدائی زندگی سے لے کر اب تک رنگ بدلتے موسموں کو دیکھا، پرکھا بلکہ منفی رُتوں کو

جھیلا بھی۔ علاوہ ازیں کراچی، لاہور، بہاول پور، وسطی پنجاب، اسلام آباد، راولاکوٹ اور سکردو، بے شمار اسفار بغرض رہائش اختیار کیے۔ انھوں نے کئی سال تک کامیابی سے ادبی صحافت بھی کی۔ اور اس دوران بہت سی غیر ادبی و ادبی خواتین و حضرات سے ملاقاتیں / نشستیں بھی کیں، یہ باہمی میل جول اور مکالمے بہت سود مند رہے۔ نگارش کی بے بدل بنیاد بنے۔ سو، آغاز شعور سے لے کر آج تک انھوں نے ادب پڑھا، ادب لکھا اور ادب ہی کو اپنی اوڑھنی بنا لیا۔ اور یوں حروف کی جنس اُن کے خون میں خوب رچ بس گئی ہے۔

اُوپر مذکور ہُوا ہے کہ عذرا اصغر کے افسانوں اور ناولوں کی بنیاد صرف ''عورت'' ہے۔ پڑھتے جایئے۔ مصنفہ بہت سی پرتیں کھولتی اور بتاتی جائیں گی کہ عورت ایک بے حد معصوم اور بے ضرر سی ہستی کا نام ہے۔ اگر وہ کہیں نوکیلی، کھردری، کڑوی اور اکھڑی اکھڑی یا بے حد غمگین نظر آئے بھی تو سوچ لیجیے کہ اُسے ضرور معاشرے کی بگاڑ نے ایسا بنا دیا ہے۔ اپنی تحریروں میں مصنفہ اہتمام کرتی ہیں کہ وہ جو کچھ کہیں یا لکھیں، سچائی اور دلی خلوص کے ساتھ لکھیں۔ صاف و سادہ انداز اور ہمہ جہت تجربے کے رچاؤ سے تحریر کو معتبر بنائیں۔ بقول ان کے، ان کی لکھی سطور ایسی تحریروں کی طرح نہیں ''جو بے جان اور کسی خود ساختہ فلسفے کا ملغوبہ ہوتی ہیں کہ قاری کے سر سے گذر جاتی ہیں اور اُسے کچھ ہاتھ نہیں آتا۔'' لیکن کچھ مصنفین کی تحریریں اور افسانے ایسے اثر انگیز بھی ہوتے ہیں جو قاری کو گھیر لیتے ہیں۔

یہاں یہ بات بھی سامنے آتی ہے کہ نسائی طبقے اور اس کے مسائل اور اُلجھنوں کو تحریروں میں خصوصی اہمیت دینا اپنی جگہ، انھیں بغور سمجھنا، زیرِ قلم لانا اور یک رنگی سے بچانا، کوئی آسان کام نہیں، تاہم ان سب نکات کو کور کرتے ہوئے عذرا اصغر کا قلم اپنی راہ سے نہیں ہٹا۔ وہ اپنی تحریروں کو درس یا لیکچر کا رنگ دیئے بغیر نسوانی جذبات و افکار کی آزادی کا علم لہراتی ہیں۔ لیکن اس کا مطلب یہ نہیں کہ عورت بازاروں یا چوراہوں پر ''میرا جسم میری مرضی'' کا نعرہ لگائے۔ وہ برملا چاہتی ہیں کہ ہر معاشرتی سطح کی خواتین کے دُکھ درد اور جذباتی مسائل کو اہمیت دی جائے اور حل تلاش کیا جائے۔ پہلے کی طرح آج بھی ان کا یہ ماننا ہے کہ گھر کی بنیاد عورت کی نرم دم محبت ہے۔ سو، گھریلو رواجوں اور اقدار میں عورت کی منشا کو تسلیم کیا جانا ضروری ہے۔ یہ بات بڑی دلچسپ ہے کہ عذرا اصغر کے افسانوں میں اکثر مرد کردار منفی نوعیت کے ہوتے ہیں۔ یہ وہ کردار ہیں جو عورت کو سمجھتے نہیں، اسے اپنے

مذموم مقاصد کی تکمیل کا ذریعہ بناتے ہیں۔ اس کے دل سے اُٹھنے والے ولولے، تکھرے، ٹھنڈے میٹھے جذبات کی قدر کرنے کے بجائے اسے ٹھیس پہنچاتے ہیں۔ سو، وہ عورت کے ''عورت پن'' کو پروموٹ کرتی ہیں کہ اس کا یہی وہ رُخ ہے جو معاشرے کی بدصورتی اور نامکمل پن میں ایک خوب صورتی کو جنم دیتا اور یوں اُسے قابل قبول بناتا ہے۔ اب ایک آخری بات، اور وہ یہ کہ دُنیا کے اولین ادوار سے لے کر آج تک ''محبت'' کو سب سے توانا اور حیات آفریں جذبہ سمجھا جاتا ہے۔ ''عورت'' اتنی بڑی دُنیا میں ایک چھوٹا سا وجود ضرور ہے، لیکن دل میں سمانے والے اس جذبے میں بڑا حصہ اسی کا ہے۔ وہ محبت کو بھی بڑا بنا دیتی ہے۔ کسی کو یقین نہ آئے تو محبت کر کے دیکھ لے! اس جذبۂ نازک پر نسائی اجارہ ملے گا۔ عذرا اصغر کے افسانوں اور ناولوں پر اسی جذبے کی چھاپ ہے اور وافر ملتی ہے۔

اب چند باتیں عذرا اصغر کی زیرِ نظر کتاب ''پھول کھلتے رہے'' کے بارے میں۔ یہ ان کا نئے سال (2025) کا نیا افسانوی مجموعہ ہے۔ یہ کتاب سامنے آتے ہی مصنفہ کی پنکھڑی دار شخصیت نظر کے سامنے آ گئی تھی۔ سو، اوپر کی سطروں میں کچھ دیر پہلا ذکر انھی کا رہا۔ اور رہی کتاب، تو یہ بھی ان کی دیگر کتابوں کی طرح مخصوص تحریری رنگ، متنوع اور سدا بہار موضوعات والی ہے۔ ہر افسانہ مصنفہ کے ایک نئے تجربے کا مظہر ہے، ان کا شخصی عکس پیش کرتا ہے۔ کُل چھتیس افسانے ہیں۔ ایک سے بڑھ کر ایک۔ تاہم چند ایک کا ذکر بطور قدمثالی۔

''ڈھلتا سورج'': نئی نسل کے دو جوان وجود اور ان کی پسند کی شادی۔ انجام ناکامی، وجہ۔ حصول جائیداد کی ہوس۔ ''وہ جب یاد آئے'': لڑکپن کے دو ساتھی۔ جوان ہوئے تو زندگی کی ڈگر پر باہم مل نہ سکے۔ جوہر زیست یعنی محبت کو چھپائے الگ الگ جیتے رہے لیکن نہ آہیں بھریں، نہ کوئی شکوہ شکایت بس صبر مسلسل۔ ''اُفق کے اُس پار'': لومیرج۔ انجام معلوم۔ الفاظ کا چناؤ اور جملوں کی بُنت بہت عمدہ۔ ''دل کی بستی'': اس شخص کی کہانی جو ازدواجی زندگی کا اہل نہیں تھا۔ اس میں روزمرہ کے بدلتے رُوپ کے حوالے اکثر ملتے ہیں۔ ''آشوبِ وقت'': یہ محبت بھرا قصہ نہیں۔ ایک شخص کے ذاتی حالات کی کروٹوں کی کہانی جو سبھی کی ہے اور پڑھنے سے تعلق رکھتی ہے۔ کتاب کے مندرجات صرف افسانے ہی نہیں، قاری کی سوچ میں وسعت لانے والی تحریریں ہیں۔

☆☆☆☆☆

''کوہِ ملال'' سعید شارق

ڈالی نگاہ سرسری ماضی سے حال کے اُدھر
تودہ تھا آہِ سرد کا کوہِ ملال کے اُدھر

.....

یہ شعر سعید شارق کے مجموعے ''کوہِ ملال'' کے نام میرا مختصر ترین خراجِ تحسین بھی ہے اور میری غیر مطبوعہ و غیر تحریر شدہ سوانح کا خلاصہ بھی۔ غزلیات پر مشتمل یہ مجموعہ کچھ عرصے سے مطالعے کی میز پر پڑا روز مجھے شاکی اور طنزیہ نظروں سے دیکھتا رہتا لیکن میری پیشہ ورانہ مصروفیات سرگوشی کرتی تھیں کہ یہ فراغت میں کرنے والا کام ہے ورنہ ناانصافی کا ارتکاب کرو گے۔ سو آج کچھ مہلت ملی تو فوری طور پر یہ قرض اتارنے کا موقع غنیمت جانا۔

سعید شارق نے جدید شاعری کی پچ/ pitch پر ٹی ٹوئنٹی کی طرز پر جس تیزی سے شاندار اننگز کھیلنا شروع کی ہیں وہ حیرت انگیز بھی ہے اور قابلِ رشک بھی۔ شارق کا گزشتہ صدی کے عبدالحمید عدم اور نوے کی دہائی سے اب تک اردو سخنوری کے پردۂ سیمیں پر نمودار ہونے والے معدودے شعرا سے موازنہ میرے خیال میں ممکن تو ہے لیکن مناسب نہیں کیونکہ اس جوان شاعر پر تخلیقی شباب ظفر اقبال کے اس شعر کے مصداق رک سا گیا ہے:

حسن اس کا اسی مقام پہ ہے
یہ مسافر سفر نہیں کرتا!!!!!!!!

.....

اپنے پہلے مجموعے کے برعکس اس بار تو ''کوہ ملال'' سے نامور عصری ناقد و محقق ڈاکٹر ناصر عباس نیر کے توصیفی کلمات کی بڑی چٹان بھی جُڑی ہوئی ہے اور میرے خیال میں اتنی معتبر سند اپنی جگہ شارق کے شاعرانہ مرتبے کا تعین کرنے کو کافی ہے۔ ساتھ ہی رحمان حفیظ، محمد حمید شاہد، ڈاکٹر طارق ہاشمی، شاہین عباس، کاشف حسین غائر، محمد عارف اور عماد قاصر جیسے اسمائے کبریٰ کے نام انتساب نے کتاب کے ابتدائی اوراق کو جگمگا رکھا ہے۔

''کوہ ملال'' کی ابتدائی ورق گردانی کے دوران اس شعر نے گویا کوہِ ندا کا کام کیا کہ بڑی دیر تک اس کے طلسم نے آنکھیں، فکر

افتخار الحق

اور سخن فہمی کی صلاحیت کو منجمد کیے رکھا:

میں بال بال بچا پھر خوشی کے سائے سے
عجب بلا ہے تری بددعا سے ٹلتی ہے

.....

اب اس کے از فردیات میں بیان کردہ مضمون کو حسنِ تضاد کہا جائے کہ طنزِ ملیح، یہ طے نہ کرنے میں زیادہ لطف ہے کہ اگر اس منفرد اور خوبصورت شعر کے متن پر لپٹی تہوں کو اتارا جائے تو پیاز کا چھلکا اتارنے سے زیادہ دیر اور محنت لگنے کا اندیشہ ہے۔ خیر! یہ ہے اس دیگ کا ایک دانہ جو اس وقت میرے سامنے کھلی پڑی ہے اور ایک طرف اشتہائے سخن میں اضافہ کرتی چلی جاتی ہے تو دوسری طرف میرے اندر موجود قدرے خفتہ تخلیقی درویش کو اشتعال دلا رہی ہے کہ وہ عالمِ وجدِ جمود سے نکلے۔

شارق کی شاعری میں فکری گہرائی اس درجے کی ہے جو کافی شدید اور طویل دورانیے پر پھیلے تجربوں کی گھاٹیوں سے مسلسل گزرنے کے بعد نصیب ہوتی ہے اور میرے لیے یہ ایک معمہ ہے کہ زمانی اکائیوں کے مطابق اس شاعر کو اتنی جلد یہ عمقِ فکر و نظر کیونکر حاصل ہوا۔ ممکن ہے زندگی کے مشکل آموختے دہراتے ہوئے تخلیقی عمل انگیز اتنا سریع التاثیر مل گیا ہو جو اکتسابی ہرگز نہیں کہلا سکتا، ورنہ ایسے شعر عمومی مشاہداتی و تجرباتی کیفیت کا نتیجہ بھلا کیسے ہو سکتے ہیں:

مسکراتے ہوئے پھیلاتا ہے بانہیں اپنی
میرے جیسا ہے شجر پھر بھی ہرا بنتا ہے
اس لیے بھی اسے آزاد نہیں کرتا میں
یہ کبوتر مرے خوابوں میں ہُما بنتا ہے

.....

''ہرا بنتا ہے'' کو شعر میں اس خوش سلیقگی سے ڈھالنا کارِ محال ہے لیکن مجھے ایسے لگتا ہے کہ متذکرہ شعر نہیں تو کم از کم ان کے مصرعے کسی لمحہ یوریکا میں بنے بنائے شارق پر وارد ہوئے ہوں گے اور پورا شعر مکمل کرنے کی انھیں کوئی جلدی نہ تھی۔ اس لیے انھوں نے اس لڈنی ارمغان کو اپنے اندر موجود نقاد کے حوالے کیے رکھا اور صیقل ہوتے ہوتے یہ شعر جب تک نگاہِ قرأت کو خیرہ کرنے کی منزل تک نہیں پہنچے انھیں سپردِ قرطاس کرنے میں متامل رہے۔

بہت باریکی سے شارق کے اسلوب کا مطالعہ کرنے پر مجھ پر یہ انکشاف ہوا کہ ان کے اندر موجود چاہِ تخیل سے پیہم ''ھل من مزید'' کی صدا انھیں ایک ناتمامی کی خلش سے دوچار رکھتی ہے اور وہ لاشعوری طور پر اسی تشنگی کو اپنی شعری تخلیقات کو درجۂ معراج

پر فائز کرنے کا وسیلہ بنائے رکھتے ہوئے اس منشیاتی مہمیز کے عادی ہوتے چلے جاتے ہیں۔

احباب! جو تخلیق کار، خاص طور پر شاعر، ان مراحل سے دوچار ہو جائے وہ انھیں طے کرنے کی خواہش دل میں لا ہی نہیں سکتا اور شارق اس پراسرار کیفیت سے دوچار رہنے کی سرشاری کا راز غالباً پا چکے ہیں۔ نتیجتاً ان کے اشعار میں خلا/ خالی پن اور ادھورے رہنے کے محسوسات بکثرت نظم ہوئے ہیں:

خوش ہوں کہ بہر حال خلا رہتا ہے مجھ میں
اور یہ بھی نکل جائے تو کیا رہتا ہے مجھ میں

وہ صفحۂ خالی ہوں جو اندر سے بھرا ہے
جو لفظ بھی مٹتا ہے لکھا رہتا ہے مجھ میں

.....

مطمئن ہو نہیں پاتا کسی شہکار سے میں
مجھ سے اوزار الجھ پڑتے ہیں اوزار سے میں

.....

جب کہیں بھی نہ رہے کچھ تو خلا بنتا ہے
میں بھی اندر سے -- مگر دیکھیے کیا بنتا ہے

.....

پُر نہیں ہے مری جگہ مجھ سے
کیا بھرے گا ترا خلا مجھ سے

.....

یہ تمام اشعار اوپر میرے تشکیل کردہ بیانیے کی حمایت کے لیے کافی ہیں کیونکہ ایک بار میں نے ضیا محی الدین سے پوچھا کہ اتنی بھرپور تخلیقی صلاحیت اور زبانِ فرنگ پر ایسا غضب ناک عبور رکھنے کے باوجود آپ اپنی انگریزی تخلیقات کا مجموعہ کیوں نہیں مرتب کرتے تو انھوں نے کچھ توقف کے بعد ایک مختصر اور بظاہر عمومی سے جملے میں یہ بات کر کے کوزے میں گویا سات سمندر بند کر دیئے تھے:

I am never satisfied
with my own work

کوئی دو عشرے قبل ان کا کہا گیا جملہ ان کی طلسماتی شخصیت کا تصور مجھ میں امر کر چکا ہے۔

سعید شارق نے اس قیمتی راز کو شاید دریافت کرنے میں اتنی محنت نہیں کرنا پڑی جتنا اسے تخلیقی مساکیت/ creative masochism کی صورت قائم رکھنے میں لگی ہوگی کہ تخلیقی عمل واقعی کربناک ہوتا ہے اور اس کیفیتِ کرب کو طول دینے میں جو لطف ہے وہ شارق کے ایسے اشعار کی شکل میں ظہور پذیر ہوتا ہے:

کتنا روشن ہے تیری یاد کا چاند
مجھ کو لگتا نہیں کہ شب ہوں میں

.....

یونہی جمتی نہیں جاتی ہے یہ کائی شارق
کسے معلوم مرا مسئلہ گہرائی ہے

.....

جیسے کہتی ہو بھلا تجھ کو ضرورت کیسی
وقت دیکھوں تو یہ لگتا ہے گھڑی ہنستی ہے

.....

مجھ کو اندر سے جکڑتا رہا اک دروازہ
اور دروازے کو باہر سے جکڑتا رہا میں

.....

خارجیت اور داخلیت کا ایسا پیچیدگی سے بھرپور تعامل جس میں، جیسا کہ ابتدائی جملوں میں عرض کیا، تضاد کی صنعت اس رنگ میں ہو کہ اسے تضاد گردانے میں بار بار تامل بھی ہو اور تائید بھی ہو، ایسے عناصر سے لبریز شعر ہی اسے جدید ترین شاعری کی اولین صف میں لا کھڑا کرتے ہیں۔

شارق اپنے ماحول سے انسلاک اور ائتلاف کرنے کے ماہر ہونے کے ساتھ انجانے میں اس کے عادی بھی ہوتے چلے گئے ہیں اور اس پیچ دار کیمیائی عمل سے ایک خوشگوار انشقاق کے ساتھ شعروں کے سالم ذرات یوں بکھرتے ہیں کہ ایک کہکشاں بنتی چلی جاتی ہے جس میں جھانکتے ہوئے یہی چمکدار کہکشاں یک بیک چاہ سیاہ/ بلیک ہول جیسی دکھنے لگتی ہے اور جونہی قاری چونک کر، ڈر کر ہرگز نہیں، پیچھے کی طرف ہٹتا ہے تو ایک قوسِ قزح دوبارہ اسے اپنی طرف لبھاتی ہے۔

صاحبو! جدید اردو غزل اسی طرز کے اسلوب و اظہار اور بُنت کی متقاضی ہے جس میں روایتی اساطیریات کے سخت بیجوں کو جدید طرز کی وارداتِ قلب کے ہاون دستے میں کوٹ کر ایک لذیذ شعری معجون کی اکسیر بنانے کی کڑی مشقت کی گئی ہو۔ جب تک سعید شارق جیسے شعرا سامنے آتے رہیں گے، اور ایسا ہونا ناگزیر ہے، ہمیں ایسی ہی معیاری اور قدآور شاعری کا آبِ حیات نصیب ہوتا رہے گا:

دیکھ شہزادی اک تیرے ہونٹوں کی جنبش سے کیا بن گیا
میں جواب تک فقط عام سا شخص تھا دیوتا بن گیا

.....

رُمیل ہاؤس آف پبلی کیشنز نے نہایت نفاست سے اس مجموعے کو 159 صفحات پر شائع کیا ہے۔ جدید غزل کے سنجیدہ قارئین کو اس کتاب سے ضرور مستفید ہونا چاہیے اور اس کے لیے صرف چند ہندسوں کو اپنے موبائل فون سے دبانا پڑے گا:

☆☆☆☆☆

جاوید صبا شاعری کا نیا افق

جاوید صبا جدید دور کے بہت عمدہ اور نہایت اہم شاعر ہیں۔ ہماری دانست میں جدید دور میں صرف وہی شاعر اہمیت کا حامل ہو سکتا ہے جو اپنے زمانے کے تقاضوں، اس کے دکھ سکھ، عذاب و ثواب اور پیچیدہ انسانی نفسیات سے بخوبی واقف ہو اور اسے شعریت کے ساتھ اپنی شاعری میں سمونے کا ہنر بھی جانتا ہو۔ جاوید صبا ان خصوصیات کے باوصف بلاشبہ جدید عہد کے اہم شاعر ہیں۔ ان کے تیسرے شعری مجموعے کا نام ''ابھی تنہائی نامکمل ہے'' اپنے آپ میں ایک مکمل شعری استعارہ ہے۔ ایک ایسا استعارہ جو امید اور ناامیدی، آس اور نراش دونوں اپنے اندر سمیٹے ہوئے ہے۔ یہ خوب صورت اور معنی سے بھرپور عنوان شاعر کے دل میں موجود ناتمام کیفیات، ادھوری خواہشات اور گہرے داخلی احساسات کی ترجمانی کرتا ہے اور قاری کے دل میں ایک ایسا احساس جگا دیتا ہے کہ وہ اس ادھورے پن میں انسانی تجربے کی اس کیفیت کو محسوس کرنے لگتا ہے جو ہمیشہ مکمل ہونے کی خواہش تو رکھتی ہے لیکن کبھی مکمل نہیں ہوتی اور اس کا نامکمل ہونا بھی تسلی کا باعث ہے تو کبھی الجھن کا۔ اس لیے نام کا تضاد دل کو یوں چھو لیتا ہے کہ دل محسوس کرتا ہے جیسے ابھی کچھ ہونا باقی ہے، کوئی احساس، کوئی تجربہ، یا پھر شاید کوئی ملاقات یا مکالمہ جو مکمل نہیں ہو پایا لیکن اس کے مکمل ہونے کا امکان ابھی موجود ہے۔ قاری اس ادھورے پن کو پوری طرح محسوس کرتا ہے اور اس چھپے ہوئے امکان کی تلاش میں خود کو مجبور پاتا ہے۔ پھر نامکمل تنہائی زندگی بھی تو ہے کہ موت تو دراصل ہے ہی کامل تنہائی۔ تو

عنبرین حسیب عنبر

گویا یہ اپنے آپ میں زندگی کی امید بھی لیے ہوئے ہے۔ دیکھا جائے تو جدید دور کے انسان کا ہر احساس، تجربہ ادھورے پن کا شکار ہے، کاملیت سے تہی، جدید انسان تکمیل کی لذت سے محروم ہے۔ نہ وصل مکمل طور پر محسوس کر سکتا ہے نہ ہجر، کیوں کہ تیز رفتاری نے سب کچھ مدغم کر دیا ہے۔ کوئی احساس، کوئی کیفیت دیرپا نہیں ہے۔ غور کیجیے تو یہ کوئی معمولی خلا نہیں ہے۔ تعلقات ہوں یا خواب، جذبات ہوں یا احساسات سب ادھورے پن کا شکار ہیں اور یہ ادھورا پن انسان کے لیے عذاب بن جاتا ہے کیوں کہ اسی ادھورے پن میں کہیں تکمیل پا جانے کا امکان بھی پوشیدہ ہے، جو انسان کو ایک طرف ہونے بھی نہیں دیتا۔ کامیابی کی بڑی طاقت ہوتی ہے مگر ناکامی کی بھی اپنی ہی ایک توانائی ہے جو کبھی کبھی کامیابی سے بھی بڑھ جاتی ہے لیکن یہ درمیان کی کیفیت انسان کی ساری توانائی سلب کر لیتی ہے۔ یعنی ہر جذبہ، احساس اور کیفیت اپنی خاص توانائی رکھتا ہے چاہے وہ وصل ہو یا ہجر، تنہائی ہو یا مجلس لیکن انسان یہ توانائی تب ہی پا سکتا ہے جب اسے یہ مکمل طور پر محسوس کرنے کا موقع ملے ورنہ اس کی توانائی انسانی وجود میں اترتی ہی نہیں۔ اب اس صورت حال میں ''ابھی تنہائی نامکمل ہے'' حقیقتاً جدید عہد کی پیچیدہ کیفیتوں کا استعارہ ہے۔ یہ ادھورے پن اور تذبذب کی وہ صورت ہے جو جدید دور کے انسان کا مقدر ہے۔ اس برق رفتار دنیا میں ایک لمحے میں انسان کو محسوس ہوتا ہے کہ ایک دنیا اس کے ساتھ ہے۔ کبھی وہ اس دنیا کی ضرورت اور ساتھ سے مطمئن یا خوش بھی ہوتا ہے اور کبھی اس قدر اکتا جاتا ہے کہ اپنے آپ سے بھی پہلو تہی کرنے کا متمنی ہو جاتا ہے مگر اگلے ہی لمحے وہ خود کو بالکل تنہا محسوس کرنے لگتا ہے اور کبھی اتنا تنہا کہ اپنا آپ بھی میسر نہیں آتا۔ جدید ٹیکنالوجی نے ساری دنیا ہاتھوں کی انگلیوں کی پوروں میں لا کھڑی کی ہے مگر سب شیشے کے اس پار ہے۔ جسے دیکھا جا سکتا ہے چھوا نہیں جا سکتا، محسوس نہیں کیا جا سکتا۔ مگر سب سامنے ہے، قریب ہے کہ وہم نے دوری کا، جدائی کا احساس ہی ختم کر دیا ہے۔ یہاں سوال یہ ہے کہ کیا جاوید صبا کی شاعری میں بھی جدید عہد اور اس کی انسانی زندگی کے مختلف پہلوؤں اور پیچیدہ نفسیات کا اظہار جدید اور عصری حسیت کے ساتھ ملتا ہے یا نہیں؟ یاد رہے کہ جدید اور عصری حسیت ہر شاعر کے ہاں نہیں پائی جاتی کیوں کہ یہ حسیت اس دور کی سماجی، معاشرتی، اور فکری تبدیلیوں سے متاثر ہوتی ہے، جو شاعر ان تبدیلیوں کو گہرائی سے محسوس کرتا ہے اور ان کو اپنے فن میں شامل کرنے کی صلاحیت رکھتا ہے، وہی

جدید اور عصری حسیت کو اپنے کلام میں شامل کر پاتا ہے۔ جدید حسیت سے مراد اپنے عہد کی تبدیلیوں، مسائل، اور نظریات کو سمجھ کر انہیں اپنے تخلیقی عمل میں ڈھالنا ہے۔اس لیے شاعر کے ہاں جدید حسیت کی موجودگی اس بات کا اشارہ ہے کہ وہ نہ صرف اپنے اردگرد کی دنیا کو سمجھتا ہے، بل کہ وہ اس کو نئے زاویے سے دیکھنے اور بیان کرنے کی قدرت رکھتا ہے اور عصری حسیت اس وقت پیدا ہوتی ہے جب شاعر سماج کے اندرونی اور بیرونی پہلوؤں کے ساتھ گہرا تعلق محسوس کرتا ہے، اور ان تبدیلیوں کا گہرا اثر قبول کرتا ہے۔ یوں شاعر کا اپنے عہد کی فکری اور سماجی تبدیلیوں سے وابستہ ہونا اور ان کو اپنے کلام میں جگہ دینا، اس کی جدیدیت اور عصری حسیت کی بنیاد بنتا ہے۔ اس حوالے سے جب ہم جاوید صبا کی شاعری کا مطالعہ کرتے ہیں تو ہمیں انسانی رشتوں کی پیچیدگی اور ان کی عارضیت، تہذیبی اور ثقافتی شکست وریخت اور بدلتی ہوئی معاشرتی اقدار کا بکھراؤ جا بجا ملتا ہے۔ چند اشعار دیکھیے:

تم ہمیں جانتے ہوتے تو نہ کرتے یہ سوال
ہم نے پوچھا ہے کبھی تم سے کہ کیا کرتے ہو

یہ دل بہت اداس ہے تھوڑا سا جھوٹ بول
بھاری پڑے گا سچ ابھی، ہلکا سا جھوٹ بول

یوں ہوا اک دن اچانک کھو گئے دس بیس سال
میں نے پہچانا اسے، اس نے نہ پہچانا مجھے

وہ تو کہیے کہ ہوئیں نم مری آنکھیں ورنہ
بولتا رہتا تو تقریر ادھوری رہتی

.....

ان اشعار میں جدید انسان کی زندگی کی پیچیدگیوں اور شکستگی کا احوال موجود ہے، جہاں وجودی مسائل کے باعث انسان خود کو اجنبی محسوس کرنے لگتا ہے۔ جدید انسان کی ٹوٹ پھوٹ اور اس کے اندر اٹھنے والے سوالات، سچ اور جھوٹ کی متضاد کیفیت، رشتوں کی عارضیت اور انسانی تعلقات کے بدلتے تیور سب کچھ ہی تو موجود ہے۔ ان کی شاعری میں نامکمل تنہائی کے تمام زاویے ملتے ہیں۔ ہمارے خیال سے ان کیفیات کی مکمل اور بہترین مثال ان کی غزل ''کوئی ہے، کوئی ہے'' قرار دی جاسکتی ہے:

کبھی آواز لگاتا ہوں کوئی ہے کوئی ہے
کبھی سرگوشیاں کرتا ہوں کوئی ہے کوئی ہے

خالی سیٹوں پہ میں رکھا ہوا رومال ہوں کیا
ہر مسافر کو بتاتا ہوں کوئی ہے کوئی ہے

پہلے خاموشی سے لے لیتا ہوں رخصت خود سے
اور پھر شور مچاتا ہوں کوئی ہے کوئی ہے

جیسے بچوں کو ڈراتے ہیں، میں اکثر خود کو
یہی کہہ کہہ کے ڈراتا ہوں کوئی ہے کوئی ہے

تو اگر کوئی نہیں ہے تو بتا دے مجھ کو
میں اسی وہم میں رہتا ہوں کوئی ہے کوئی ہے

میں ہوں شاید کسی ملبے سے سرکتا ہوا ہاتھ
چیختا رہتا ہوں زندہ ہوں کوئی ہے کوئی ہے

تم اگر ہو بھی تو کیا ہے، جو نہیں ہو بھی تو کیا
جتنا میں بھیڑ میں تنہا ہوں کوئی ہے کوئی ہے
(خدا اور انسان دونوں کی طرف سے مایوسی جدید تنہائی کی دین ہے)
پوچھتے پوچھتے تھک جاتی ہے خلقت ترا نام
میں مسلسل یہی کہتا ہوں کوئی ہے کوئی ہے

.....

اس غزل کی جتنی بھی تعریف کی جائے کم ہے۔ اس غزل میں تکراری ردیف ہی اس اضطراب، بے چینی، اضطرار، امید و بیم کو ظاہر کرتی ہے جو اس مابعد جدید دور کے انسان کا مقدر ہے۔ اس کا سبب وہ اجنبیت ہے جو سرمایہ دارانہ نظام کی خاص دین ہے۔ محسوس کیجیے کہ پہلے وقت تیزی سے بھاگتا تھا لیکن اب تو انسان خود کو وقت کی رفتار سے بھاگنے پر مجبور پاتا ہے۔ لیکن مایوسی دیدنی ہے کہ اس دوڑ بھاگ کا حاصل حصول کچھ نہیں ہے۔ رشتے ناطے، دوستی یاری، خلوص و محبت، وفا و توقع سب ہاتھ سے نکل رہے ہیں۔ تیز رفتار زندگی نے انسان کو اندرونی سکون اور زندگی کے حقیقی معنی سے کہیں دور کر دیا ہے۔ اس رفتار میں انسان اپنی ذات اور انسانی اقدار کے درمیان خلا محسوس کر رہا ہے، اور جیسے جیسے وقت کی رفتار بڑھتی جاتی ہے، یہ خلا بھی گہرا ہوتا جا رہا ہے کیوں کہ یہ تیز رفتار کامیابی، کسی شے کا حصول محض عارضی تسکین ہے جو اندرونی طور پر انسان کو خالی اور تنہا چھوڑ جاتے ہیں۔ اس صورت حال میں انسان تنہائی تو محسوس کرتا ہے مگر دنیا کی مداخلت اس تنہائی کو مکمل بھی نہیں ہونے دے رہی۔ یہاں سے جدید دور کی انسانیت کے وجودی سوال جنم لیتے ہیں جو جاوید صبا کی شاعری کا مرکز ہیں۔ دیکھا جائے تو وجودی مسائل ہمیشہ سے انسان کا مقدر رہے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ یہ مسائل کلاسیکی شاعری میں بھی ہمیں ملتے ہیں کہ:

نہ ابتدا کی خبر ہے، نہ انتہا معلوم
رہا یہ وہم کہ ہم ہیں، سو وہ بھی کیا معلوم
(فانی)

یا

اسیرِ جسم ہوں میعاد قید لا معلوم
یہ کس گناہ کی پاداش ہے خدا معلوم
(شاد عظیم آبادی)

وجودی مسائل جدید شاعری میں بھی موجود

ہیں، لیکن ان دونوں کے احساس اور انداز بیاں میں نمایاں فرق ہے۔ کلاسیکی شاعری میں وجودی مسائل عموماً روایتی انداز میں، فلسفیانہ اور استعاراتی زبان میں بیان کیے گئے ہیں، جب کہ جدید شاعری میں یہ مسائل زیادہ براہ راست، ذاتی، اور معاصر تجربات کے تناظر میں پیش کیے جاتے ہیں۔ جدید شاعری میں وجودی مسائل زیادہ ذاتی اور نفسیاتی پہلوؤں کے ساتھ مل کر سامنے آتے ہیں، اور ان میں انسانی تعلقات، تنہائی، اور فرد کی شناخت شامل ہوتے ہیں۔ جاوید صبا کی شاعری اس کی عمدہ مثال ہے، جہاں وجودی مسائل کو موجودہ دور کی حساسیت اور فرد کی داخلی جدوجہد کے تناظر میں پیش کیا گیا ہے۔ جاوید صبا اپنی شاعری کے ذریعے جدید اردو شاعری میں وجودی مسائل کو منفرد انداز میں پیش کرنے میں کامیاب رہے ہیں، جہاں ہر شعر انسان کی تنہائی، بے بسی، اجنبیت اور اس کے داخلی انتشار کو سامنے لاتا ہے۔ ان کی شاعری انفرادیت، زندگی کی حقیقتوں اور جدید انسان کی اذیت ناک داخلی کیفیتوں کو نمایاں کرتی ہے:

آہ سے ضبط کی تاثیر ادھوری رہتی
یہ کڑی کھلتی تو زنجیر ادھوری رہتی
وہ تو اچھا ہوا کوئی بھی مرے ساتھ نہ تھا
کوئی بھی ہوتا تو تصویر ادھوری رہتی

.....

لکیر کھینچی تھی اس نے تعلقات کے بیچ
مجھے بھی اپنے لیے دائرہ بنانا پڑا
پڑی ہوئی تھی گرہ کی طرح مری تاریخ
کھلی تو پھر مجھے کیا کیا نہیں بھلانا پڑا

.....

گزر رہے ہیں تمہارے بغیر بھی مرے دن
مگر یہ دن بڑے بے کار سے گزر رہے ہیں

.....

یہ موضوعات اور جذبات کلاسیکی شاعری سے بالکل الگ ہیں، جہاں جاوید صبا انسان کی جدید زندگی کی اذیتوں، بے سمتی، لایعنیت، تنہائی، جدید انسان کی شناخت کی جدوجہد اور اجنبیت کو انتہائی خوب صورتی اور شدت سے پیش کرتے ہیں۔ ان کے اشعار جدید انسان کے اندرونی تضاد، جذباتی انتشار، اور اس کے وجودی مسائل کو ظاہر کرتے ہیں۔ اتنا ہی نہیں بلکہ جاوید صبا کی شاعری میں محبت کا جذبہ بھی روایتی رومانی محبت سے آگے بڑھ کر ایک گہری وجودی (existential) کیفیت میں تبدیل ہو جاتا ہے۔ ان کے اشعار میں محبت ایک ایسا تجربہ بن کر ابھرتی ہے جو ذات، فکر اور معاشرتی رویوں کی پیچیدگیوں کے ساتھ منسلک ہے۔ یہ محبت ایک ایسا کرب اور بے چینی پیدا کرتی ہے جو محض محبوب کی جسمانی قربت سے تسکین نہیں پاتا بل کہ اس میں فکری، جذباتی اور روحانی تعلق کا عنصر بھی

نمایاں ہے۔ چند مثالیں دیکھیے:

ساری دنیا سے تم نے وحشت کی
حد نہیں ہو گئی محبت کی

.....

محفلوں میں جس محبت سے گلے ملتے ہیں آپ
اس طرح کی دوستی ہوتی تو ہے، چلتی نہیں

.....

ایک سفر میں جب ہم دونوں جدا ہوئے تھے
تم وہ آنکھ میں ٹھہرا ٹھہرا آنسو ہونا

.....

بلا کی تیز خرامی ہے ساتھ چھوٹ نہ جائے
ہم آج وقت کی رفتار سے گزر رہے ہیں

.....

جانے کیوں ملتے ہی دھڑکا سا بچھڑنے کا لگا
پہلی بار ایسے ملے جیسے ملے آخری بار
آخری بار صدا دے کے سدا سوچتا ہوں
ایک بار اور پکاروں گا اسے آخری بار

.....

خدا حافظ براہ مہربانی
مجھے جانے دیں رستہ چھوڑ دیجے
نظر سے گر کے ٹوٹا ہے تعلق
اگر یہ جُڑ سکے تو جوڑ دیجے

.....

وہ کبھی ایسے اچانک کہیں مل جاتا ہے
گم شدہ چیزوں کا جیسے سر راہے ملنا
میں جسے چاہتا ہوں اس سے گریزاں ہوں صبا
چاہتا ہے جو مجھے وہ بھی نہ چاہے ملنا

لڑکھڑا کر گر پڑے دونوں انا کے موڑ پر
راستہ سیدھا تھا لیکن پاؤں الٹا پڑ گیا

.....

حسب معمول تخیل کا سفر ہے درپیش
آپ آ جائیں تو رُخصت کی اجازت لے لوں

.....

وفا کے قحط میں بے پیرہن ہے
محبت کیا نچوڑے کیا نہائے

.....

ان مثالوں سے واضح ہے کہ یہ محبت گہری بھی ہے، عارضی بھی ہے، تلخ بھی اور پیچیدہ بھی۔ اس میں وجودی کرب بھی ہے اور اندیشے بھی۔ یہ محبت کا تصوراتی اظہار نہیں بلکہ حقیقت پسندانہ بیان ہے۔ جدید دور کا ایک اہم مسئلہ اجتماعی جبر اور معاشرتی ناانصافی بھی ہے اور جاوید صبا اس سے چشم پوشی نہیں کرتے، کوئی بھی باشعور شاعر ایسا کر ہی نہیں سکتا۔ اس لیے ان کی شاعری میں جمالیاتی لہر کے ساتھ ساتھ اجتماعی جبر اور معاشرتی ناانصافی کے خلاف احتجاج کا عنصر بھی نمایاں طور پر ملتا ہے۔ ان کی شاعری، خاص طور پر ان کی نظمیں، نہ صرف حسن اور محبت کے جذبات کو سمیٹے ہوئے ہیں بلکہ جدید دور کی پیچیدہ زندگی میں انسان کی جدوجہد کو بھی واضح کرتی ہیں۔ دراصل آج کے دور میں اجتماعی جبر اور معاشرتی ناانصافی ایک ایسے زہر کی طرح پھیل چکے

ہیں جس نے سماج میں انصاف کی جڑوں کو کھوکھلا کر دیا ہے۔ آج سچ کچل کر جھوٹ کو سچ کے روپ میں پیش کر دیا جاتا ہے۔ سماج کے اندھے پیمانوں نے انصاف کو جبر کے پتھر تلے دفن کر دیا ہے، جہاں سچائی کی چیخیں، خاموشی کی زنجیروں میں قید ہو جاتی ہیں۔ اس تاریکی میں انسانیت کے چہرے کی تلاش ایک خواب بن چکی ہے اور ہم فقط سایہ بن کر اسے ڈھونڈنے کی لاحاصل کوشش میں مصروف ہیں۔ جاوید صبا کی شاعری میں اجتماعی جبر اور معاشرتی ناانصافی کے خلاف احتجاج اور جدید دور کی پیچیدہ زندگی کی جدوجہد کا عنصر خوب صورتی سے شامل ہے۔ یہ شاعری ایک متوازن انداز میں فرد کی ذاتی اور اجتماعی سطح پر زندگی کے مختلف پہلوؤں کو بیان کرتی ہے۔ ان کی نظموں میں قدار ابن سالف، پوسٹ مارٹم، عورت، زینب، یہی کرو گے نا، اجازت دو مرے بچو اور دیگر کئی نظمیں بطور مثال پیش کی جا سکتی ہیں۔ غزلوں میں بھی عہد حاضر کا یہ کرب جھلکتا رہتا ہے کہ:

ممانعت تھی خبردار اب جو رویا کوئی
جو رو رہے تھے انہیں قہقہہ لگانا پڑا

.....

کوئی آسیب اٹھا کر تجھے لے جائے گا
مت اٹھا اتنے سوالات خدا کے بندے

.....

یہ شہر شہر عجب قحط آب و دانہ پڑا
چھتوں پہ بیٹھے پرندوں سے منہ چھپانا پڑا
فرات عصر پہ قبضہ تھا اور بچوں کو
وہ پیاس تھی کہ مجھے زہر تک پلانا پڑا

.....

علاقہ پوچھا گیا اور زبان پوچھی گئی
لہو میں ڈوب کے پھر خوئے میزبانی گئی

.....

حافظہ چھین لیا ہے غم دوراں نے صبا
میں نے جو لکھا پڑھا تھا وہ مجھے یاد نہیں

.....

ہم کہاں آپ کی محفل کے ہیں لائق صاحب
طور شاہانہ الگ ، طرز فقیرانہ جدا

.....

جاوید صبا کی شاعری میں یہ طنزیہ اور کہیں استفہامیہ انداز بھی ان کا خاص انداز ہے جو بالخصوص انسانی رویوں اور رشتوں کی کھوج میں مدد دیتا ہے:

یہ تو سب ٹھیک ہے تم سب سے وفا کرتے ہو
وہ بتاؤ جو وفاؤں کے سوا کرتے ہو

.....

شکست و فتح مقدر کا کھیل ہے ورنہ
جو ہار جاتے ہیں کیا بے دلی سے کھیلتے ہیں

.....

جسے لکھنا نہیں آتا وہ لکھے
جسے پڑھنا نہیں آتا پڑھائے

.....

''ابھی تنہائی نامکمل ہے'' کے مطالعہ سے ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ مجموعی طور پر، یہ شاعری نہ صرف انسانی جذبات کی گہرائیوں کو بیان کرتی ہے بلکہ زندگی کے فلسفے، سماجی جبر، بے گانگی، اور محبت کی پیچیدگیوں کو بھی بڑی خوب صورتی سے پیرایہء اظہار عطا کرتی ہے۔ اس شاعری میں جہاں ایک طرف فرد کی داخلی دنیا کی کہانی ہے تو دوسری طرف اس کے گرد موجود سماجی بے حسی اور حالات کا بھی ذکر کیا گیا ہے۔ جاوید صبا کی شاعری میں حقیقت اور خواب کے درمیان ایک خوبصورت توازن پایا جاتا ہے - وہ نہ صرف انسان کے اندرونی جذبات و خیالات کے آئینہ دار ہیں بلکہ انسان کے پوشیدہ داخلی جذبات کو بھی ایک نیا رنگ دیتے ہیں - ان کے اشعار میں فلسفیانہ جھرمٹ اور وجودی سوالات کی ایک گہری پرت ہوتی ہے، جو قاری کو تفکر کی دعوت دیتی ہے۔ جیسا کہ ابتدا میں کہا جا چکا ہے کہ جدید دور کی امید و ناامیدی کا ملاپ اس دور کی خاصیت ہے - لہٰذا اس مجموعے کی خاصیت بھی یہ ہے کہ اس میں امید کی کرن بھی موجود ہے کہ ابھی تنہائی نامکمل ہے۔ ان اشعار میں یہ رُخ دیکھیے :

اک گھنے پیڑ کے سائے میں بسیرا کرتے
کسی تصویر میں دیکھا تھا اسے آخری بار

آخری بار صدا دے کے سدا سوچتا ہوں
ایک بار اور پکاروں گا اُسے آخری بار

.....

روز اک صورت دیگر میں نمو کر کے صبا
تُو اضافہ ہی کیے جا مری حیرانی میں

.....

مثال ابر کوئی خواب سا ہے سایہ فگن
ہم اپنے سایہ خود کار سے گزر رہے ہیں

.....

یہاں ہر جدائی کے بعد ملنے کی امید بھی ہے۔ جاوید صبا کی شاعری کی خصوصیت یہ ہے کہ وہ ہر بار ایک نئی سمت کی طرف لے جاتی ہے اور قاری کو نت نئے احساسات سے بھر دیتی ہے۔ یہی جدید دور کی خاصیت ہے کہ امید و بیم ساتھ ساتھ چلتے ہیں۔ یہاں ایک اہم بات پر بھی غور کرنا ضروری ہے جو جاوید صبا کے اسلوب کو منفرد بناتی ہے اور وہ ہے جاوید صبا کا تخلیقی وفور۔ ان کی شاعری میں تخلیقی وفور نمایاں طور پر موجود ہے، جس کا اظہار ان کی منفرد تعبیرات، دل کش استعاروں، اور گہرے جذبات میں ہوتا ہے۔ ان کے کلام کی خصوصیت یہ ہے کہ وہ انسانی جذبات کی پیچیدگیوں کو انتہائی خوب صورت انداز میں بیان کرتے ہیں۔ ان کی زبان میں تشبیہات، استعارے اور علامتیں بھی نئی دنیا کی آئینہ دار ہیں، جنھیں جدید انسان کے مسائل اور احساسات کی بہتر

تفہیم کے لیے استعمال کیا گیا ہے۔ جاوید صبا کی شاعری میں تخلیقی وفور کی جھلک ہر مصرعے میں ملتی ہے، جہاں وہ زندگی کے گہرے تجربات اور انسانی جذبات کو نہایت پیچیدہ اور نیا انداز دینے میں کامیاب ہوتے ہیں۔ ان کی شاعری میں علامتوں اور استعاروں کا استعمال واضح اور متحرک انداز میں کیا گیا ہے، جو قاری کو ایک نیا شعور فراہم کرتا ہے۔ یہاں مثالوں کے لیے ان کی کچھ نظمیں اور غزلیں دیکھتے ہیں ''قدار ابن سالف'' نامی نظم میں قدار ابن سالف کا ذکر ایک طاقت ور استعارے کے طور پر کیا گیا ہے جو سماج میں قوت، اقتدار اور ظالموں کی حکمرانی کے خلاف مزاحمت کی علامت بنتا ہے۔

''قدار ابن سالف'' کا زندہ رہنا اور اس کا دوبارہ اٹھ کھڑا ہونا ایک استعارہ ہے جو نظام کے خلاف بغاوت کی علامت بن گیا ہے۔ یہاں تک کہ ''قدار ابن سالف'' کے ذریعے جاوید صبا ان طاقتوں کو چیلنج کرتے ہیں جو تاریخ میں ظلم و جبر کی نمائندہ بن کر اُبھریں اور اس سے آگے بڑھتے ہوئے، وہ اس بات کو اجاگر کرتے ہیں کہ مظلوم اب طاقت ور بن کر دشمن کے سامنے آ رہے ہیں۔

اسی طرح ''پوسٹ مارٹم'' میں خون کی تشبیہہ نہایت تخلیقی انداز میں استعمال کی گئی ہے، جہاں لہو جیسا کوئی سیال ہے لیکن لہو ہرگز نہیں ہے کے ذریعے وہ خون کے بہاؤ کی ساخت اور اس کے علامتی معنوں کو بیان کرتے ہیں۔ اس میں ''لہو'' کا نہ ہونا ایک فکری اشارہ ہے جو اس بات کو اجاگر کرتا ہے کہ خون ایک جسمانی سیال تو ہوتا ہے، لیکن جب انسان کی روح مر جاتی ہے، تو اس کا حقیقی درد اور اس کی چیخ خاموش ہو جاتی ہے۔

نظم ''زینب'' میں انھوں نے ایک کمسن بچی کی مظلومیت کو نہایت دل گداز انداز میں پیش کیا ہے۔ یہ نظم نہ صرف فرد کی ذاتی کہانی کو بیان کرتی ہے بلکہ پوری سماجی حقیقت کو سامنے لاتی ہے۔ وہ سماج جہاں ہم اپنی معاشرتی ذمہ داریوں سے غافل ہو چکے ہیں۔ ''مجھے کوئی بتاتا کیوں نہیں'' کے ذریعے وہ معصومیت کی دردناک خاموشی اور اس کے بیچ موجود سوالات کو ظاہر کرتے ہیں جو معاشرتی بے حسی کے خلاف ایک تیز حملہ ہے۔

ان مثالوں سے ظاہر ہے کہ جاوید صبا کی شاعری میں جو جدید تشبیہات اور استعارے ہیں وہ ایک نئی شعری زبان تخلیق کرتے ہیں، جیسے کہ ''کسی لاوے کی مانند'' (پوسٹ مارٹم) اور ''مردہ زینب کا قصہ'' میں جنسی زیادتی کے بعد کی منظر کشی۔ یہ تخلیقی وفور اس بات کو ثابت کرتا ہے کہ ان کی شاعری نہ صرف روح کو جھنجھوڑتی ہے بلکہ ہمیں سماج کی تلخ حقیقتوں سے بھی روشناس کراتی

ہے۔ ان کے استعاروں اور تشبیہات میں بے ساختگی اور جرأت ہے، جو اردو شاعری میں ایک نیا موڑ اور منفرد تجربہ پیش کرتی ہے۔ ان کی نظم ''آخری ٹھوکر'' تو پوری نظم ہی کمال مثال ہے:

آخری ٹھوکر

ہواؤں کو گریباں سے پکڑ لو
نچوڑ دو دھوپ کا دامن
کسی سائے کو چٹکی کاٹ کر بھاگو
لپیٹو دشت و دریا کو
پھر اُن کو
ٹانگ دو
بادل کی چھت سے
اور ایسے میں
کسی ڈالی سے لپٹی نظم
کی بانہوں میں بانہیں ڈال کر پوچھو
کہ اُس کے آخری مصرعے پہ کیا گزری
گلِ سرسبز و شاداب و معطر کی قبائے چاک کا مطلع
مکمل کیوں نہیں ہوتا
یہ ویرانہ جسے روزن سے باہر جھانکنے تک کی
اجازت لینی پڑتی ہے
در و دیوار کو ڈھا کر نکل آئے
نکل آئے کہ اب اک آخری ٹھوکر پہ رکھے ہیں
کلہ کج کے مینارے
شبِ ہستی کے ہرکارے

.....

اسی طرح ان کی غزلوں کے اشعار مختلف موضوعات اور جذبات کو بیان کرتے ہیں اور ان کی زبان میں جو پیچیدگی اور گہرائی ہے وہ نہ صرف فنی مہارت کا مظہر ہے بلکہ مختلف انسانی جذبات کی پیچیدگیوں کو بھی کھولتی ہے۔ ہر غزل جیسے ایک نیا منظر، ایک نیا خیال ہے۔ بیشتر غزلیں، غزلِ مسلسل محسوس ہوتی ہیں۔ ان اشعار میں انفرادیت اور تخلیقی قوت دیکھیے:

کشتگانِ رہینِ غازہ سے
ہر دکاں دار نے رعایت کی

.....

اہلِ جنوں کو چاکِ گریباں سے کیا غرض
اپنی بلا سے کوئی تماشا کرے کرے

.....

ڈوبی نہیں ہے کشتیٔ دل اور ابھی سے تم
بیٹھے ہو دور دور کھڑے ہو پرے پرے

.....

یہ قیامت بھی گزرنی تھی پریشانی میں
آج دل ٹوٹ گیا دل کی نگہبانی میں

.....

موجِ سرکش نے اچھالا سرِ ساحل ورنہ
دست و پا کتنے چلاتا کوئی طغیانی

.....

ادب آداب الگ ساقی و پیمانہ جدا
میرا میخانہ جدا ہے ترا میخانہ جدا

.....

ان تشبیہات اور استعارات میں جاوید صبا کا انتہائی تخلیقی وفور ظاہر ہے، جہاں وہ ہر

تصویر منظر، یا جذبے کو نیا رنگ اور معنی دے رہے ہیں- ان کی شاعری کی انفرادیت اسی میں ہے کہ وہ نئے زاویے سے سوچنے کی دعوت دیتی ہے- یہ تخلیقیت اپنے قارئین کو سوچنے پر مجبور کرتی ہے اور ان کی شاعری میں گہرائی پیدا کرتی ہے- یہ اشعار زندگی کی پیچیدگیاں، محبت کی نزاکتیں اور انسان کی داخلی کش مکش کو پیش کرتے ہیں، جو نہ صرف شاعری کی جمالیات کو اجاگر کرتے ہیں بلکہ انسانی جذبات کی حقیقت کو بھی سامنے لاتے ہیں- جاوید صبا کی شاعری میں ہمیں نہ صرف حقیقت اور فریب کے بیچ کا کھچاؤ ملتا ہے بلکہ یہ ادراک بھی ہوتا ہے کہ انسان کی داخلی دنیا میں کتنے مختلف رنگ موجود ہیں- ان کے اشعار میں ایک تڑپ ہے، ایک ایسی شدت ہے جو ان کے قارئین کو اپنی گرفت میں لے لیتی ہے اور ان کے کلام کو اپنی انفرادیت سے روشن کرتی ہے-

ان تشبیہوں اور استعاروں کے استعمال سے وہ اپنے مخصوص ذاتی تجربات، احساسات اور تفکر کو نئی اور مختلف روشنی میں پیش کرتے ہیں - جاوید صبا کی شاعری میں، موجودہ حقیقت سے باہر نکل کر کوئی اور جہت تلاش کرنے کی ایک مسلسل کوشش ہوتی ہے- وہ نہ صرف محبت اور غم کو شاعری کا موضوع بناتے ہیں بلکہ انسان کی مختلف حالتوں، اس کے اکیلے پن، اس کے دکھ، اور اس کی زندگی کے سچے پہلو کو نمایاں کرتے ہیں-

ان کا اسلوب صاف، سادہ اور تیز ہوتا ہے لیکن اس سادگی کے پیچھے ایک گہری معنویت پوشیدہ ہے- جو انھیں دوسروں سے ممتاز بناتی ہے-

جاوید صبا کی شاعری نہ صرف جدید عہد کے انسان کی داخلی پیچیدگیوں کو واضح کرتی ہے بلکہ ان کی شاعری میں موجود وجودی سوالات اور اذیتیں ایک گہری سماجی اور نفسیاتی حقیقت کو ظاہر کرتی ہیں- ان کے اشعار میں تنہائی، بے بسی، اور شناخت کی جدو جہد کے تجربات ہمیں ایک ایسے دور میں زندہ انسان کے اندر چھپے ہوئے تناؤ اور بے چینی سے آگاہ کرتے ہیں جو تیز رفتار تبدیلیوں اور سماجی عدم استحکام میں خود کو تلاش کرتا ہے- ان کی شاعری ایک ایسا آئینہ ہے جو ہمیں اپنے عہد کی حقیقتوں کو براہ راست دیکھنے کی دعوت دیتی ہے، جہاں محبت اور تنہائی کی وابستگیاں وجودی مسائل کے ساتھ جڑ کر ایک نیا زاویہ پیدا کرتی ہیں- جدید اور عصری حسیت کے باعث ان کا کلام جدید اردو شاعری میں ایک منفرد مقام رکھتا ہے- حقیقت یہ ہے کہ جاوید صبا نے نہ صرف اپنے دور کی انسانی کیفیات کو سچائی کے ساتھ پیش کیا ہے بلکہ ادب میں ایک نیا شعری افق بھی قائم کیا ہے-

☆☆☆☆☆

کلیم خارجی: دیو جانس کا مجاور (ایک کلاسیکی افسانہ)

خیبر پختونخوا میں اُردو افسانے کی تاریخ کا مطالعہ کیا جائے تو افسانے کی زمین دوسرے اصناف کے مقابلے میں زیادہ ذرخیز نہیں اور یہی وجہ ہے کہ افسانہ نگاروں کی تعداد نہ ہونے کے برابر ہے۔ گمنامی کے ایسے بحرِ بے کراں ادبی سمندر میں کلیم خارجی اپنی تخلیقی فنکاری اور مہارت کے بل بوتے پر اپنے افسانوی سفر کو پروان چڑھا رہے ہیں۔ کلیم خارجی خیبر پختونخوا میں ادب کی اہم ترین شخصیت ہیں۔ انہوں نے افسانہ نگاری میں مہارت کا ثبوت دیا ہے۔ ان کا افسانہ دورِ جدید کے فنی تقاضوں اور لوازمات کے ساتھ ارتقاء کے مختلف منازل کو بتدریج طے کرتا ہوا خیبر پختونخوا کی ادبی سرزمین کو میراب کر رہا ہے۔ اس حوالے سے ڈاکٹر اسحاق وردگ لکھتے ہیں:

''خیبر پختونخوا کے جدید اُردو افسانے پر نظر ڈالیں تو خالص افسانہ نگاروں کی صف میں خالد سہیل ملک اور کلیم خارجی پر نظریں ٹھہرتی ہیں، جن کا تخلیقی وجود تمام تر انہماک کے ساتھ افسانہ نگاری کے لئے وقف ہو چکا ہے۔ کلیم خارجی کا انفراد یہ ہے کہ وہ ''مزاحمتی ادب'' سے اُٹھنے والی افسانے کی پہلی معتبر اور جدید تخلیقی شخصیت ہیں۔ اس تناظر میں وہ پختونخوا کے فکشن میں سماجی حقیقت نگاری کے بنیاد گزار ہیں'' (۱)

ایک بڑے اور سچے افسانہ نگار کا فن اور شخصیت جن عناصر سے کاملیت کا درجہ پاتی ہے وہ تمام عناصر کلیم خارجی کو قدرت کی طرف سے عطا ہوئے ہیں۔ اس کے پاس معنویت کے خزانے لیے بے شمار لفظ ہیں۔ خوب صورت تخلیقی جملے ہیں۔ فکر اور احساس سے معمور موضوعات ہیں، تجربات کا نچوڑ اور مشاہدات کی عمیق گہرائی ہے۔ کہانی سناتے ہوئے کردار ہیں، پسِ دیوار رونما ہونے والے واقعات کی بصیرت ہے اور سب سے بڑھ کر یہ اس کے پاس اپنی بات

ہمایون خان

کہنے اور دوسروں تک پہنچانے کا سلیقہ ہے۔
کلیم خارجی علامت ساز سہی مگر وہ علامتوں کے انبار میں کہانی کو دفن کرنے کا قائل نہیں بلکہ اس کے اکثر افسانوں میں تو ہر لفظ، ہر علامت اور ہر جملہ بذات خود ایک الگ کہانی کی صورت اختیار کر جاتا ہے۔ کہانی اور علامت کے اس حسین امتزاج کو پڑھ کر اس کا قاری ایک لمحے کے لئے سوچتا ہے اور پھر اگلے ہی لمحے ایک عجیب سرشاری کے عالم میں داخل ہو جاتا ہے۔ وہ اپنے قاری کی سنجیدگی اور ذہانت پر کوئی شک کیے بغیر کمال مہارت سے علامتوں کے پیرائے میں ایسی کہانی بیان کرتا ہے کہ قاری دیر تک ان کے لفظوں کی میٹھی چبھن سے خود کو آزاد نہیں کر پاتا۔

اُس کے افسانوں میں خود کلامی کا ایک انوکھا انداز نظر آتا ہے جہاں اکثر مقامات پر کردار خود اپنے ہی وجود سے برآمد ہونے والے کردار سے ہم کلام رہتا ہے مگر یہ تیکنیک اُس نے محض افسانے لکھنے کے لئے استعمال نہیں کی بالکل اس کے پیچھے ایک ایسا کرب انگیز احساس دکھائی دیتا ہے جو جبر اور مجبوریوں میں خود سے بچھڑنے کا دُکھ سناتا ہے۔ اس حوالے سے ان کا افسانہ ''دیو جانس کا مجاور'' ایک جدید کلاسیکی افسانہ ہے۔

''دیو جانس کا مجاور'' کلیم خارجی کا ایک امر رہنے والا افسانہ ہے۔ اس افسانے کا موضوع کلاسیکی، انوکھا اور چونکا دینے والا ہے۔ افسانے کی زبان و بیان، مکالمے، خاکہ نگاری، انسانی نفسیات کی عکاسی، تجسس و جستجو اور پیش کش سب کچھ اتنے بہترین انداز میں ہیں کہ مشہور زمانہ افسانوں کفن، لاجونتی، گڈریا، آنندی، زرد گلاب، الحمدللہ، اُترن، گھر سے گھر تک، ٹوبہ ٹیک سنگھ اور کالی شلوار وغیرہ کا تاثر اور اسلوب ملتا ہے۔

''دیو جانس کا مجاور'' وقت کے تقاضوں کو پورا کرنے کیلئے مصنوعی خول میں قید دوہری شخصیت کے عذاب کو سامنے لاتا ہے۔ یہ ایک ایسے معاشرے کی کہانی ہے کہ جہاں اصلیت کہیں گم ہو گئی ہے۔ یہ ہمارے اس اجتماعی رویئے پر بھرپور طنز ہے جس میں ہم بنا سوچے سمجھے پتھر اُٹھا کر بھیڑ میں شامل ہو جاتے ہیں اور انجانے میں ان لوگوں کو سزا دیتے ہیں جن کا اصل میں کوئی قصور نہیں ہوتا۔

''دیو جانس کا مجاور'' شہر کے لوگوں سے الگ تھلگ دور ایک ٹیلے پر رہائش اختیار کرتا ہے اس دوران انسانی رشتوں کو تعین کرتا ہے۔ آج کے معاشرتی حالت، کیفیات اور انسانی تعلق کے نئے راز سے آشنا ہوتا ہے۔ کلیم خارجی افسانوی مہارت کے ساتھ کہانی کو تخلیقی عمل سے گزارتا ہے۔ انسانی نفسیات اور خود پسندی کے ساتھ حقیقت پسندی کا عنصر اس افسانے

کو چار چاند لگا دیتا ہے۔ ''دیو جانس کا مجاور'' کا ایک اقتباس ملاحظہ کریں:

''بیوی بنا کر انسان ایک کمین گاہ بنا لیتا ہے۔ جہاں پر وہ چاہتا ہے کہ اس کی پسند اور اعتماد کے لوگ آئیں۔ انسان کا شادی شدہ ہونا اس کے گھٹیا پن، بزدلی اور خود غرضی پر کتنی خوب صورتی سے پردہ ڈال دیتی ہے''(۲)

دیو جانس کی جس آدمی سے ملاقات ہوتی ہے وہ نایاب اور حقیقت و اصلیت جاننے کے احساس سے مالا مال تھا۔ مگر خود دیو جانس کی اپنی اصلیت انتہائی پست درجے کی نکلی یہی وجہ تھی کہ وہ صرف مجاور تو بن سکا مگر دیو جانس بننے کا خواب پورا نہ ہو سکا۔ نمونے کا اقتباس ملاحظہ کریں:

''کسی کو بُرا سمجھنے میں ایک پل بھی نہیں لگتا کیوں؟ اس لئے کہ ہمارے اندر اس قدر بُرائی ہوتی ہے کہ باہر کی ذرا سے بُرائی اندر طوفان مچا دیتی ہے اور ہمیں فوراً کوئی رائے اور فیصلہ کرنا پڑتا ہے''۔(۳)

دیو جانس افسانے کے بارے میں ڈاکٹر محمد اویس قرنی یوں رقم طراز ہیں:

''دیو جانس کا مجاور'' کلیم خارجی کے افسانوی مجموعے ''گھٹیا آدمی'' کا شاہکار افسانہ ہے۔ خوب صورت جملوں اور ٹریٹمنٹ کے کمالات سے بھرپور۔ یہاں دو زندگیاں سامنے لائی گئی ہیں ایک وہ جس میں انسانی معاشرتی مخلوق ہونے کی نسبت مختلف رشتوں کی زنجیروں میں بندا ہوا ہے اور ایک وہ رشتہ جو ذات و عرفات ذات سے ہے۔ کلیم کے من کی یہ ترنگ ان کی تخلیقی سرشاریوں کی دین ہے''۔(۴)

کلیم خارجی کے ہاں انسانی نفسیات کی عکاسی بھی ملتی ہے۔ دیو جانس کا کردار بھی نفسیاتی طور پر ذہنی خلل کا شکار ہے۔ ''دیو جانس کا مجاور'' میں اس نے زمانہ حال کے لوگوں کی ذہنی اور نفسیاتی کیفیات کی عکاسی کی ہے۔ افسانے کا اقتباس ملاحظہ کریں:

''اب محبت اور صداقت کی بجائے قوت خرید پر بھروسہ کیا جاتا ہے۔ لوگ اپنا اپنا ساتھی خریدتے ہیں اور پھر عمر بھر اُس کی محبت اور وفا خریدنے کی فکر میں پڑتے رہتے ہیں۔ لیکن امر یہ ہے کہ خریدی ہوئی چیزیں اپنا متبادل بھی رکھتی ہیں یہی وجہ ہے کہ گھر بازاروں کے قریب بنا کر لوگ مطمئن اور خوش رہتے ہیں تاکہ اپنی قوت خرید کا مظاہرہ کر سکیں''۔

کلیم خارجی کے افسانے ''دیو جانس'' میں لفظیات کے چناؤ سے لے کر جملوں کی ترتیب تک اس کی قلمی اور ذہنی مشقت کی کہانی سناتی ہے۔ اس کی جان کاہی اور مسلسل ریاضت کا ثمر یہی ہے کہ اب اس کے ہاں چیخ سناٹے میں بدل جاتی ہے اور بذات خود چیخنا شروع کر دیتا ہے۔ نمونے کا ایک اقتباس ملاحظہ کریں:

''اُس نے ممونیت سے میری بیوی کی طرف دیکھا اور محبت کی بے تکلفی سے بولا تم لوگوں

نے شادی کیسے کی؟ یعنی کس نے کس کو چُنا۔ میرا قہقہہ نکل گیا اور مجھ سے رہا بھی نہیں گیا۔ میں نے کہا میرے سنجیدہ دوست: دُنیا میں اکثر بلکہ ہمیشہ مرد ہی عورت کو چنتے ہیں۔ عورت خود کو اس قابل بنائے رکھتی ہے کہ کوئی اُسے چن لے وہ خود کبھی یہ کام نہیں کرتی، میں نے اُسے چنا ہے''۔

کلیم خارجی کے کلاسیکی فن کا دائرہ جہاں سماجی، تہذیبی، تمدنی اور ثقافتی جہاں پر محیط ہے وہاں یہ انسانی سوچ اور فکر کے مختلف دائروں کو اپنے دامن میں سمیٹے ہوئے ہے۔ وہ اپنے جدید اور کلاسیکیت کے فن میں محض اپنے داخلی محسوسات اور جذبات کی بات نہیں کرتا بلکہ وہ مجموعی طور پر حالات و واقعات کا تجزیہ کرتا ہے۔ یہ تجزیہ سطحی نہیں بلکہ جامع اور بلیغ ہوتا ہے۔

کلیم کارجی کے افسانوی فن کے بارے میں پروفیسر گوہر رحمان نوید اپنے مضمون ''شہر افسانہ نگاری کا مکین'' میں یوں لکھتے ہیں:

''کلیم خارجی کے افسانوں کے مطالعے سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ وہ دُنیا کو خلقہ دام خیال سمجھتے بلکہ حیات کو خوش فہمیوں اور خوابوں کے سہارے گزارنے والوں کو جھنجھوڑ کر اپنا حق مانگنے پر اُکساتے ہیں۔ وہ رومانوی لکھاریوں کی طرح وقت کو پھولوں اور کلیوں کے چٹکنے سے تعبیر نہیں کرتے بلکہ انسان کو قلزم ہستی سے مانند حباب اُبھرا ہوا ہیرا سمجھا ہے۔ اس لئے زندگی بھر اس زیاں خانے میں انسان کا امتحان قرار دیتا ہے''۔(۵)

''دیو جانس کا مجاور'' کلاسیکی، علامتی اور استعاراتی امتزاج سے بھرپور افسانہ ہے۔ کلیم خارجی نے اس افسانے کو جن علامات اور زاویوں سے تشکیل دیا ہے اُس کا تعلق عصری حالات کے انسانی جذبوں، اس کی تمناؤں اور آرزوں سے ہے۔ بطور نمونہ یہ جملے ملاحظہ کریں:

''میری خوشی آزادی اور سچائی کی خوشی ہے۔ ہر اُٹھتے قدم کے ساتھ میری خوشی میں اضافہ ہتا ہے۔ میرا کوئی گھر نہیں جس کا دروازہ کھلا رہ جانے کا مجھے خوف ہے نہ ہی کسی کمرے کی آرائش وسجاوٹ کی فکر ہے''۔(۶)

''بات یہ تھی کہ میں نے آسمانی طاقتوں کی دُعا کی تھی کہ مجھے کوئی ایسا خوب صورت وجود تحفے میں عطا کریں جس کی پرورش اور تہذیب میں خود کر کے اس سے محبت اور صرف محبت کروں''۔(۷)

خیبر پختونخوا میں کلیم خارجی اُردو افسانہ نگاری کا ایک معتبر حوالہ ہیں جو ادب کے دامن کو افسانوی صنف سے مالا مال کر رہے ہیں۔ خیبر پختونخوا کے افسانوی ادب کی زرخیز آبیاری میں کلیم خارجی اپنا تخلیقی اور ادبی کردار ادا کر رہے ہیں۔

☆☆☆☆☆

رباعیاتِ محمد نصیر ''زندہ'' ایک فکر و احساس کی روشنی

ایک دن فیس بک پر محمد نصیر ''زندہ'' کی رباعی پڑھی تو دل کی دھڑکن تیز ہو گئی۔ اگرچہ عصرِ حاضر کے شعرا اور ادیب دن رات اپنی تخلیقات یا دوسروں کے کلام سے صفحات بھرتے ہیں، مگر اس دورِ فتن میں جب ہماری اقدار دم توڑ رہی ہیں اور انسان مادیت کے شکنجے میں جکڑا جا رہا ہے، ایسے میں ''زندہ'' صاحب کا کلام ایک تازہ ہوا کا جھونکا محسوس ہوا۔ کہیں گل و بلبل کے روایتی مرثیے ہیں تو کہیں فرسودہ عشقیہ داستانیں، مگر یہ رباعیات اپنے اندر معاشرتی بے چینی، انسانی آزادی اور بیداری کے وہ رنگ سموئے ہوئے ہیں جو آج کے دور کا المیہ بیان کرتے ہیں۔

''زندہ'' کے کلام میں فکری گہرائی اور عصری آہنگ اُن کے اشعار صرف الفاظ کا جادو نہیں، بلکہ سوچ کی وہ کسک ہیں جو قاری کو جھنجوڑتی ہے۔ مثال کے طور پر:

ملتا نہیں جینے کا بہانہ ہم کو
اے زورِ ستم نہ آزمانا ہم کو

ہم کل کی آنکھ میں بغاوت کا خواب
تعبیر میں روئے گا زمانہ ہم کو

.....

یہاں ''بغاوت کا خواب'' محض رومانوی بے قراری نہیں، بل کہ موجودہ نظام کے خلاف ایک شعوری احتجاج ہے۔ اسی طرح ''گاؤں آزاد کرو'' جیسے مصرعے سماجی ناانصافی کے خلاف شعلہ بیانی ہیں۔

گلزارِ قلم کی چھاؤں آزاد کرو
مزدورِ سخن کا گاؤں آزاد کرو

محمد افراہیم بٹ

تدبیر سے کھولو نفرت کی زنجیر
تقدیرِ بشر کے پاؤں آزاد کرو

.....

''زندہ'' کا مفہوم جب میں نے تلاش کیا تو اس میں فکر کی بقا ملی۔ یوں شاعر کا تخلص ''زندہ'' محض ایک نام نہیں، بلکہ ایک فلسفہ ہے۔ ان کے نزدیک ''زندہ'' وہی ہے جو اپنے عہد کے سوالوں سے ٹکرائے، خاموشی کی زنجیر توڑے، اور آنے والی نسلوں کو سوچنے کا راستہ دے۔ جیسا کہ وہ کہتے ہیں:

سورج کی ہو کرن معطل کیسے
ڈالے کوئی روشنی میں بل کیسے

خوشبو نہیں ہوتی پھول کی مٹھی میں بند
آزادی کی روح ہے مقفل کیسے

.....

یہاں ذکر کرتا چلوں کہ پوٹھوہار کی علمی روایت و میراث کو محمد نصیر نے ''زندہ'' رکھا ہے۔ خطہ پوٹھوہار جہاں دریائے سندھ اور جہلم کی ثقافتی رگوں نے علم و ادب کو سینچا، وہاں ''زندہ'' صاحب بھی اسی دھرتی کے فکری ورثے کو آگے بڑھا رہے ہیں۔ ان کا کلام نہ صرف مقامی رنگ رکھتا ہے، بلکہ عالمی سطح پر انسانی حقوق اور آزادی کی تحریکوں سے ہم آہنگ ہے۔ ان کی شاعری میں خاموشی کو جبر کی علامت بتایا گیا ہے۔ اور وہ خاموشی توڑنے کی دعوت دیتے ہوئے کہتے ہیں :

امید شکن مرگ تمنا دی ہے یہ
شب ناک نمو کی سحر ایجادی ہے یہ

پازیب ہے احساس جفا کی خاموش
جمہور فریب عیش آزادی ہے یہ

.....

یہاں وہ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کی طرف اشارہ کرتے ہوئے جتاتے ہیں کہ ''خاموشی'' کوئی فضیلت نہیں، بلکہ ظلم کے آگے سپر ڈالنے کی متروک روایت ہے۔

آخر میں عرض کرتا چلوں کہ محمد نصیر ''زندہ'' کی رباعیات ہمیں یاد دلاتی ہیں کہ شاعری محض تخیلی پن نہیں، بلکہ ایک ذمہ داری ہے۔ اللہ ان کے قلم کو مزید جلا بخشے تا کہ یہ فکری مشعل ہمیشہ روشن رہے۔ آپ بھی ان کے کلام کو ضرور پڑھیں — یہ صرف شعر نہیں، بلکہ ایک تحریک ہے۔

میری دعا ہے کہ اللہ محمد نصیر ''زندہ'' کو صحت، سکون، اور فکر کی مزید توانائی عطا فرمائے۔ آمین

☆☆☆☆☆

شاعر علی شاعر کی حمدیہ و نعتیہ شاعری کا تحقیقی جائزہ

اُردو ادب میں ہم حمد اُس نظم کو کہتے ہیں جس میں رب کائنات کی تعریف بیان کی جاتی ہے۔ اسی طرح نعتِ رسولِ پاک صلی اللہ علیہ وآلہ واصحابہ وسلم ثنا و توصیف کی ایک ایسی پاکیزہ، نازک اور ارفع شعری شکل ہے جس میں ہر لفظ کو لکھتے ہوئے قلم کو احتیاط کی ضرورت ہوتی ہے۔ شاعر علی شاعر کا شمار بھی ایسے ہی حمد و نعت کہنے والے شعراء میں ہوتا ہے جو ''باوضو'' ہو کر حمد کے اشعار میں اپنی عقیدت و ایمان کے گل ہائے معطر حمدیہ اشعار کی لڑیوں میں پرو کر باری تعالیٰ کے اوصافِ حمیدہ اور اسمائے حسنیٰ کے گل ہائے معطر سجاتے ہیں۔ اُن کے حمدیہ کلام سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ اُنھوں نے قرآن و حدیث کا گہرا مطالعہ کیا ہے، اِس لیے تو اُن کے کلام میں قرآن و سنت کے پاکیزہ اُصولوں کے موتی دل و نظر کو آگہیِ خداوندی سے سرفراز کرتے ہیں۔ اُن کی حمدیہ شاعری کا خوب صورت اور روحانیت سے بھرپور اوّلین شعری مجموعہ ''ارمغانِ حمد'' ۲۰۰۵ میں شائع ہُوا۔ اِس کتاب کی خاص انفرادیت یہ ہے کہ اِس میں لفظ اللہ کے اعداد ۶۶ کی مناسبت سے ۶۶ حمدیں اور ربِ کائنات کے ۹۹ ناموں کی مناسبت سے ۹۹ حمدیہ ہائیکو احاطۂ تحریر میں لائی گئی ہیں۔ حمدیہ ہائیکو میں اُن کا منفرد لب و لہجہ دیکھنے کو ملتا ہے کیوں کہ اُردو ادب کی دیگر اصناف کی طرح حمدیہ ادب بھی مسلسل

صدام ساگر

ارتقا پذیر ہے اور نت نئی جہتوں کی روشنی میں ارتقا کی منازل طے کر رہا ہے اور ہر نیا آنے والا حمدیہ کلام سامعین کی توجہ کا مرکز بنتا ہے۔ شاعر علی شاعر کا حمدیہ مجموعہ ''ارمغانِ حمد'' اپنے ظاہری اور باطنی حسن و دل کشی کی بدولت حمدیہ ادب میں نئی روشنی لے کر آیا ہو گا اور اُس نے ارتقائی سفر میں مشعلِ راہ کے طور پر اپنا اہم کردار ادا کیا ہو گا۔ ''ارمغانِ حمد'' سے ایک شعر دیکھیے:

ہر سانس پہ لکھوں میں حمدِ جنابِ باری
رحمت سے اپنی مجھ کو ایسی سخن وری دے

.....

حمدیہ کلام کی طرح اُنھوں نے اپنی نعت میں سیرتِ مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وآلہ واصحابہ وسلم کے بہت سے پہلوؤں کو خوب صورت الفاظ میں بیان کیا ہے۔ ''صاحبِ خیرِ کثیر صلی اللہ علیہ وآلہ واصحابہ وسلم'' شاعر علی شاعر کا نعت کے حوالے سے نقشِ اوّلین ہے جو خوب صورت نعتوں اور نعتیہ ہائیکو پر مشتمل ہے، جس میں دلی کیفیات اور احساسات و جذبات کے ساتھ ساتھ نبیِ رحمتِ دوجہاں حضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہ واصحابہ وسلم کی مدحت بڑے عمدہ انداز میں کرتے ہیں، جس میں اُن کی نعتوں میں درِ مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وآلہ واصحابہ وسلم کی خوشبوئیں، گنبدِ خضریٰ کے نور سے مزین یہ روشن نعتیں، حرا کی چاندنی ہمارے دلوں کو خوشیوں اور خوشبوؤں سے پُرنور کرتی ہیں۔ اُن کے نعتیہ کلام کے مطالعہ سے پتا چلتا ہے کہ اُن کی شاعرانہ خوبی آسان، سادہ، سلیس اور قابلِ فہم الفاظ کا چناؤ ہے۔ یوں زبان کی سادگی اور سلاست و روانی اُن کے کلام کو چار چاند لگا دیتی ہے۔ وہ نہایت سادہ، قابلِ فہم، چھوٹی اور مترنم بحروں میں نعتیں لکھتے ہیں۔ اُن کی نعت کا ایک مطلع دیکھیے:

پیکرِ انوار کی مدحت کے چُن چُن کر گلاب
مغفرت کے واسطے میں لکھ رہا ہوں یہ کتاب

.....

شاعر علی شاعر ایک کہنہ مشق اور بالخصوص حمد و نعت گو شاعر ہیں۔ وہ تواتر کے ساتھ اور نئے انداز و آہنگ سے حمد و نعت کہتے ہیں۔ اُن کا دوسرا نعتیہ مجموعہ ''الہام کی بارش'' ہے۔ اِس مجموعے میں طویل ردیفوں کا استعمال بڑی عمدگی کے ساتھ کیا گیا ہے۔ بعض ردیفوں کی تکرار سے ترنم پیدا کیا گیا ہے جو سننے والوں کو اپنے سحر میں لے کر سرور و آگہی کا سامان میسر کرتی ہیں۔ شاعری میں اُن کے

اُستاد ''مہر سعید ملتانی'' ہیں اور کیے بعد دیگرے شفیع بسمل، منصور ملتانی اور آخر میں سہیل غازی پوری سے اصلاح لیتے رہے ہیں۔ اُن کا باقاعدہ شاعری کا آغاز ۲۶ سال کی عمر میں ہُوا۔ ان کی غزلوں کا مجموعہ ''بہارو اب تو آجاؤ'' ۲۰۰۴ میں منظرِ عام پر آیا۔ اس مجموعے کے بعد اُن کی حمدیہ و نعتیہ شاعری کے مجموعے اور دیگر کتب شائع ہوئیں، جس میں عالمی سطح کا اوّلین مجموعہ ''ترویناں'' بھی شامل ہے جسے اوّلین کا اعزاز حاصل ہے۔

اُن کی تمام شعری اصناف کا تحقیقی جائزہ ہمیں شاہد عمران کے تحقیقی مقالے میں ملتا ہے، جنھوں نے ایم فل اُردو کی سند حاصل کرنے کے لیے ''شاعر علی شاعر کی حمدیہ و نعتیہ شاعری کا فکری و فنی تجزیہ'' بڑی ہنر مندی سے کیا ہے۔ یہ مقالہ ڈاکٹر عرفان توحید وٹو کی نگرانی میں مکمل کیا گیا ہے۔ یہ مقالہ چار ابواب پر مشتمل ہے، اِس مقالے میں خاص پہلو اُن کی حمدیہ و نعتیہ شاعری ہے، جس پر بڑی تفصیل سے روشنی ڈالی گئی ہے۔ پہلا باب شاعر علی شاعر کے احوال و آثار سے متعلق ہے جس میں اُن کی پیدائش، تعلیم و تربیت، خاندانی پس منظر، پیشہ، ازدواجی و ادبی زندگی اور ادبی تخلیقات کا مطالعہ کیا گیا ہے، جس سے پتا چلتا ہے کہ شاعر علی شاعر کے آباؤ اجداد بھارت کے مشہور شہر دہلی کے رہنے والے تھے، جو تقسیمِ ہند کے وقت ہجرت کر کے پاکستان کے مشہور شہر ملتان میں سکونت پذیر ہوئے۔ اُن کے دادا حافظ انور دہلوی شہرِ دہلی کی ایک علمی اور روحانی شخصیت کے حامل تھے جنھیں سب ادب و احترام کی نظر سے دیکھتے تھے۔ اُن کے والدین اِس قدر مستقبل شناس تھے کہ اُنھوں نے اپنے اِس بیٹے کا نام شاعر علی رکھا، جس میں اُنھوں نے بہ طور تخلص شاعر کا اضافہ کر لیا اور اِسی نام سے آج ہر عام و خاص میں مقبولیت کی سند رکھتے ہیں۔ اُنھوں نے جس وقت ملتان کو خیر آباد کہا اُس وقت اُن کی عمر ۱۹ برس تھی اور غلام فرید جیسے پیارے دوستوں کی صعوبتیں میسر تھیں۔ اُن کا پہلا شعر کچھ یوں ہے کہ:

جب جب تجھ سے بچھڑا دل
مثلِ دلی اُجڑا دل

اِس مقالہ کے باب اوّل میں فصلِ سوم میں اُن کی حمدیہ و نعتیہ تصانیف کا تعارف بڑی عرق ریزی سے بیان کیا گیا ہے۔ دوسرا باب شاعر علی شاعر کی نظم نگاری اور غزل گوئی کے موضوعاتی جائزے سے متعلق ہے۔

تیسرا باب ان کی نثری خدمات سے متعلق ہے۔ چوتھے باب میں اُن کی حمدیہ و نعتیہ شاعری کا فکری و فنی مطالعہ شامل ہے۔ اس کے علاوہ ''محاکمہ'' بھی درج کیا گیا ہے اور محاکے میں تمام نتائج جامعیت کے ساتھ پیش کرنے کی سعی کی گئی ہے۔ آخر میں جن کتب سے استفادہ کیا گیا ہے اُن کی فہرست دی گئی ہے۔ اس پورے مقالے کے مطالعے کے دوران ہمیں کسی قسم کا چربہ، سرقہ کوئی شہادت نہیں ملتی، جس سے یہ بات کھل کر سامنے آتی ہے کہ یہ مقالہ عمران شاہد کی ذاتی تحقیقی کاوش ہے، جس کے لیے وہ بے پناہ تحسین و ستائش کے سزاوار ہیں۔ اُن کا یہ مقالہ اُردو ادب اور نسلِ نو کے لیے ایک خوب صورت اضافہ ہے۔

شاعر علی شاعر کی حمدیہ و نعتیہ شعری مجموعوں کے علاوہ اُن کی غزلوں میں بعض اشعار حمد و نعت کے پڑھنے کو ملتے ہیں اِن اشعار میں اللہ تعالیٰ اور اُس کے محبوب امام الانبیاء حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وآلہ واصحابہ وسلم سے محبت اور عقیدت کا اظہار کرتے ہیں۔ اُن کے زیادہ تر اشعار میں خانۂ کعبہ اور روضۂ رسول صلی اللہ علیہ وآلہ واصحابہ وسلم پر حاضری دینے کے لیے اپنے دل کی بے چین کیفیت ایک ایسی تڑپ بن کر ظاہر ہوتی ہے جو صرف عاشقِ رسول صلی اللہ علیہ وآلہ واصحابہ وسلم کو ہی نصیب ہوتی ہے: ملاحظہ فرمائیں:

مدینے کی جانب اُڑا لے چلے جو
خدایا میں تجھ سے وہ پر مانگتا ہوں

.....

شاعر علی شاعر ایک باشعور، خوش فکر اور آدابِ توحید و رسالت سے آشنائی رکھنے والے شاعر ہیں۔ اُن کے حمدیہ و نعتیہ افکار فروغِ حمد و نعت کے حوالے سے ہمارے تقدیسی ادب کا روشن باب کہلائیں گے۔ شاعر علی شاعر کا فنی کمال اور اُن کی والہانہ محبت و عقیدت نعت کے ہر ہر شعر سے جھلکتی ہے اور دربارِ رسالت مآب صلی اللہ علیہ وآلہ واصحابہ وسلم میں نعت کی صورت اُنھوں نے اپنی محبتوں، چاہتوں اور عقیدتوں کے جو چراغ روشن کیے ہیں میری دعا ہے اللہ کریم انہیں مزید روشنی اور توانائی بخشے، جب کہ حمد کے اشعار میں وہ نیکیاں اکٹھی کرنے کے بجائے اپنی اور دوسروں کی بخشش کی دعائیں مانگتے، اِس شعر کے مصداق نظر آتے ہیں:

بخشش ہو بے سبب کہ تو پروردگار ہے
اعمال میں ہمارے خطائیں بھی آئیں گی

☆☆☆☆☆

''بچے ہمارے عہد کے'' [طنز و مزاح]

شریر کہیں کے ------!!!

کہا گیا بچے تو غیر سیاسی ہوتے ہیں---

بچے سیاسی ہوں یا غیر سیاسی ہمیں اس پر کوئی اعتراض کبھی نہیں رہا اس لیے کہ ہماری نظر میں یہ ان کا اپنا ذاتی معاملہ ہے اور کسی کے ذاتی معاملات میں پڑنا ہم روا بالکل بھی نہیں سمجھتے -ان کے گول مٹول ہونے یا گھر کی رونق کہلانے پر بھی کبھی تنقید کا لفظ ہماری زباں سے نہیں نکلا (اگرچہ ہم اپنی دانست میں ان دعووں کو مبالغہ آمیز گردانتے ہیں)- بچوں کی معصوم شرارتوں کو بھی ہم نے کبھی شک کی نظر سے نہیں دیکھا کیونکہ گھروں کے اندر کی سنجیدہ فضا کو متوازن و متناسب رکھنے کے لیے ہم ان شرارتوں کو نہ صرف ضروری خیال کرتے ہیں بلکہ بسا اوقات اپنی ہلکی سی مسکراہٹ سے اس کی داد بھی دیتے چلے آئے ہیں - ہماری ادنیٰ سی آرزو فقط اتنی رہی ہے کہ یہ شرارتیں فی الحقیقت معصوم اور بے ضرر ثابت ہوں اور کبھی معصومیت کی حد سے آگے بڑھ کر بڑوں اور بزرگوں کے لیے ذہنی فتور کا باعث نہ بنیں- ہم یہاں اس اعتراف میں بھی خود کو حق بجانب سمجھتے ہیں کہ جب جب بھی یہ شرارتیں معصومیت کے دائرے سے باہر نکل کر ہماری جیب ، ذاتی ڈائری اور عینک تک جا پہنچی ہیں تو ہمیں افہام و تفہیم کی فضا کو خیر باد کہہ کر مجبوراً اس معصوم فتنے کے مقابلے پر میدان میں اترنا ہی پڑا ہے-

ابھی پرسوں ہی کی بات ہے کہ اپنی اماں بی کے ساتھ مہمان بن کر آنے والے ہمارے تین چار سالہ بھانجے درد کی تفسیر بن کر آنکھوں کے ڈھیلوں سے موٹے موٹے آنسوؤں کے قطرے ڈھلکاتے ہمارے کمرے میں چلے آئے اور مظلومیت کی تصویر بن کر پرسوز آواز میں پکارے کہ:

''دیکھیں نہ ماموں جان ! گھر کے دروازے میں پھنس کر ہماری نازک انگلی کتنی زخمی ہو چکی ہے؛ درد کی شدید ٹھیسیں اٹھ رہی ہیں - ہم چونکہ بہادر ہیں اس لئے اپنی چیخوں کو زبردستی ضبط کئے ہوئے ہیں؛ وگرنہ ہم چلا چلا کے رو بھی سکتے ہیں---''

ہم نے پہلے تو ان کی بہادری کی باقاعدہ داد دیتے ہوئے انہیں قریب بلایا اور پھر گہری

نور کمال شاہ

نظر سے انگلی کا جائزہ لیتے ہوئے فکر مندی سے بولے: اوہو گڈو میاں! یہ تو واقعی آپ کی انگلی بہت زخمی ہو چکی ہے؛ اب کیا کیا جائے؟ اچھا بتاؤ! یہ اب کیسے ٹھیک ہوگی؟ کون سی دوا لگائی جائے؟-

اس نے بڑی معصومیت سے علاج بتا دیا:

"ماموں جان! یہ دوا وغیرہ لگانے سے ٹھیک نہیں ہوگی بلکہ مونگ پھلی سے ٹھیک ہوگی، پہلے بھی ایک دو دفعہ مونگ پھلی سے ٹھیک ہو چکی ہے- آپ مونگ پھلی منگوا لیں، دیکھنا درد جاتا رہے گا"-

اور ہمیں بچے کی انگلی ٹھیک کروانے کے لئے دوائی کے طور پر مونگ پھلی منگوانی ہی پڑی- حیرت تب ہوئی جب واقعی اس سے انگلی کا درد ٹھیک بھی ہو گیا- کچھ دیر بعد جب اس کی ماں نے پرلے کمرے سے نمودار ہو کر پوچھا کہ بھئی یہ مونگ پھلیاں کہاں سے آئیں تمہارے پاس؟ کس نے دی ہیں تجھے؟ تو وہ فخریہ انداز میں سینہ پھلا کے بولے:

"گنجے ماموں نے ------!!!"-

اور ہم اپنا انوکھا لقب سن کر ماتھا اور سر پیٹتے ہی رہ گئے-

بلاشبہ یہ خوشبو کی شاعرہ پروین شاکر (مرحومہ) کا حسن ظن ہی تھا کہ انھوں نے بچوں کی شرارتوں کو چالاکی کا دلکش نام دے ڈالا مگر ہم تو اسے چالاکی کی آڑ میں کھلی بے باکی ہی کہیں گے-

گھر میں مطالعے کے لیے مخصوص ہمارے چھوٹے سے کمرے میں پڑی میز پر ڈائری اور قلم ہر وقت موجود رہتے ہیں- روزمرہ کے ہنگاموں سے گھبرا کر ہم کبھی کبھی سخن کی فکر کے بہانے یہاں آ کے بیٹھ جاتے ہیں اور خیالات کے طوطے اڑاتے رہتے ہیں؛ ایسے میں اچانک کوئی انوکھا خیال ذہن پر وارد ہو تو ہم فوراً اسے قلم کے شکنجے میں کس کر ڈائری میں قید کر لیتے ہیں- گزشتہ سال ہمارے کچھ دور پار کے مہمان اپنے دو شوخ و شنگ بچوں سمیت ہمارے مہمان بنے- ایک بچی کی عمر چار پانچ سال ہوگی جبکہ دوسرا بچہ شاید ڈھائی تین سال کا تھا- یقین مانیں شرارت کا اصل مفہوم ان بچوں کے کرتوت دیکھ کر ہی ہماری سمجھ میں آیا- جب سے یہ لوگ آئے تھے ہمیں خود اپنے ہی گھر میں اپنا آپ اجنبی اجنبی سا لگنے لگا تھا- ان کے آمد کی برکت سے ہمارے گھر سمیت پورے محلے نے فجر کی نماز بروقت ادا کرنی شروع کر دی تھی- وہ یوں کہ ان بچوں میں سے کوئی ایک علی الصبح اذانوں کے ساتھ ہی انتہائی بلند اور غیر مہذب انداز میں رونا شروع کر دیتا تھا- یہ مشق کم و بیش آدھے

گھنٹے تک ضرور جاری رہتی تھی؛ ساتھ ہی ساتھ ماں کی چمکارنے پچکارنے والی بے سری صدائیں ماحول کو دوآتشہ بنا لیتی تھیں- یہ ظالم تب ہی خاموش ہوتے جب سارا محلہ خود کو کوستے اٹھ نہ کھڑا ہوتا- ستم بالائے ستم یہ کہ محلے بھر کو جگانے کے بعد یہ فتنہ پرداز خود آرام سے دوبارہ سو جاتے اور کوئی پہر دن چڑھے ہی بیدار ہوتے-

آفت کے یہ پرکالے دن بھر نت نئی مہم جوئی کی جستجو میں رہتے تھے- ہمارا مطالعے کا کمرہ کھلا پا کر ایک دن وہاں بھی گھس گئے اور اپنی موجودگی کے ان مٹ نقوش چھوڑ کر ہی وہاں سے نکلے- ہمیں صورت حال کی سنگینی کا ادراک اس وقت ہوا جب تنہائی کی گود میں سما کر خود پہ حال طاری کئے ہوئے ہم نازل شدہ اشعار کو نقل کرنے وہاں پڑی اپنی ڈائری کھول بیٹھے - دیکھ کر ہاتھوں کے طوطے ہی اڑ گئے- ڈائری کے صفحات طرح طرح کی گل کاری سے رنگین بن چکے تھے- کہیں پہ گدھے کی تصویریں بنانے کی بھونڈی کوششیں کی گئی تھیں تو کسی صفحے پر نئے زمانے کی لیلیٰ کو پریوں کے لباس میں زمین پہ اتارا گیا تھا - کسی صفحے پر ہندسہ نویسی اور حروف سازی کا مقابلہ ہو چکا تھا- اہم یادداشتوں اور ضروری رابطہ نمبروں والے صفحوں پر اندھا دھند قلم چلا کر اس کی دھار تیز کرنے کی مربوط کوششیں ہو چکی تھیں - دل تو چاہتا تھا کہ عدم تشدد کو خیر باد کہہ کر ابھی ان ناہنجاروں کی خبر لیں مگر فساد کے اندیشے سے اپنے ارادے سے باز رہے-

اس سے اگلے دن کتے کے بچے کی سالگرہ منانے (حالانکہ اس کتے کے بچے کو گلی سے پکڑ کر گھر میں لانے کے تین دن بھی پورے نہیں ہوئے تھے) کی دلکش تقریب میں ہماری عینک ڈوری سے باندھ کر بطور تحفہ اس کے گلے میں لٹکائی گئی - وہ تو شکر ہے ہم بروقت پہنچے اور اپنی عینک اور عزت دونوں کو کتے پہ قربان ہونے سے صاف بچا لیا-

آقائے یاری خان کے سامنے بات چھڑی تو بولے: ''بچوں کی بھی ایک ہی کہی- آپ نے کبھی راہ چلتے کسی بچے کا تقاضا نہیں سنا---- ہم سے پوچھو تو پتہ چلے- ہم جس محلے میں رہتے ہیں وہاں خیر سے بچوں کی تعداد اتنی تیزی سے بڑھ رہی ہے جتنی تیزی سے ہمارے ہاں مہنگائی بھی نہیں بڑھتی - آئے دن نت نئے بچوں سے سامنا ہوتا رہتا ہے- ایک دفعہ بچوں کے ایک گروہ کے سامنے سے گزرتے وقت ایک بچے نے

اچانک پیچھے سے آواز دی- ہم نے مڑ کے دیکھا تو پکارنے والے بچے نے تحکمانہ انداز سے کہا: ''بابا جی! اس بچے کو چھانٹے ماریں یہ مدرسے نہیں جا رہا''-

اول تو انداز تکلم پہ غصہ آیا کہ اب ہم محض پچاس سال کی عمر میں کہاں کے بابے بن گئے- دوم اس عمر میں بچے کو تھپڑ مارنے کی بھلا کیا تک ہو سکتی تھی (بچے کو مارتے ہوئے ہم بھلا خاک اچھے لگیں گے)- ساتھ ہی دوسرے بچے نے ملزم بچے کو دھمکاتے ہوئے بلند آواز میں کہا کہ؛ دیکھو! مدرسے نہیں جاؤ گے تو یہ بابا جی اغوا کر کے لے جائیں گے تجھے--- لو اب ہم ان کی نظر میں اغوا کار بھی ٹھہرے-''

ہم حیرت سے یاری خان کی طرف دیکھ رہے تھے اور تھوڑا سکون بھی محسوس کر رہے کہ بچوں کے جبر کا شکار فقط ہم ہی نہیں ہیں بلکہ اور بھی بہت سے افراد یہ ستم سہتے چلے آ رہے ہیں- انھوں نے بات جاری رکھی؛ ''اور سنو؛ گھر کو لوٹتے وقت ایک دن ہم نے ایک دیوار کے سائے میں چند بچے کھڑے دیکھے جو شاید آپس میں کسی راز و نیاز میں مصروف تھے- ایک کے ہاتھ میں لمبی سی چھڑی تھی- جیسے ہی ہم ان کے قریب پہنچے؛ ایک بچے نے ''السلام علیکم'' انکل کا نعرہ لگا کر ہاتھ مصافحے کو آگے بڑھایا مگر جب ہم نے اپنا ہاتھ ملانے کے لئے آگے کیا تو وہ شریر ہمیں نظر انداز کرتے ہوئے اپنا ہاتھ کان کی طرف اٹھا کر اسے کھجانے لگا- باقی بچے زور زور قہقہے لگانے لگے- غصہ تو بہت آیا مگر پی گئے- ہم خفیف سے ہو کر آگے چلے تو چھڑی والے بچے نے فوراً ہی ہاتھ میں پکڑی چھڑی دیوار میں موجود سوراخ میں ڈال کر تیزی سی گھمائی- دیوار کی درز میں بھڑوں کا چھتا تھا جس کا ہمیں اندازہ نہیں تھا- بچے تو اس حرکت کے بعد ''ارے بھاگو'' کا فلک شگاف نعرہ لگا کر فوراً بھاگ اٹھے مگر معاملہ جب تک ہماری سمجھ میں آتا، آٹھ دس بپھری ہوئی بھڑیں سوراخ سے نکل کر چشم زدن میں ہمارے سر پہ پہنچ چکی تھیں- چہرے، کان اور گردن پہ چمٹ گئیں اور بے دردی سے کاٹا- شدید درد اور سوجن سے ہمارا برا ہی حال تھا- شام تک ہمارا منہ غبارے کی مانند پھول چکا تھا اور دو دن تک ہم کسی کو منہ دکھانے کے قابل ہی نہ رہے-

سو میرے بھائی! میرا مشورہ مانیں اور اس پھڈے میں نہ ہی پڑیں- اس مخلوق سے بچ کے رہنا ہی ہمارے بہترین مفاد میں ہے-

☆☆☆☆☆

سردار سدھو سنگھ ڈِنگی

ہمارے اگلے مشاعرے میں سردار سدھو سنگھ ڈنگی براستہ یورپ تشریف لا رہے ہیں۔ انھوں نے بہت ہنس مکھ اور ملنسار طبیعت پائی ہے بس انھیں دیکھ کر آپ ہنسے بغیر رہ نہیں سکتے کیونکہ ایکسپورٹ کوالٹی کی غزل کہتے پائے جاتے ہیں لیکن پتا نہیں کیوں انھوں نے ایک نئے ''بھوترتے'' ہوئے گلوکار چاہت فتح علی خان کے ساتھ البم بنانے کا معاہدہ کرلیا ہے اب ان کی غزل کے ساتھ فوٹو چاہت فتح علی خان کی لگے گی۔ اس مشاعرے کا سارا انتظام ہمارے معروف شاعر وصی شاہ کر رہے ہیں کیونکہ دونوں ایک دوسرے کی تحریروں سے خاصے متاثرہ ہیں اتنے متاثر ہیں کہ اب ان کا شمار بھی ڈنگوی متاثرین میں ہونے لگا ہے۔ یہ ایک دوسرے کے اشعار اور کتابوں کے نام الٹا ونگا اور ڈنگا کر کے اپنا کام سیدھا کرتے ہیں اور اپنے کلام کا یونہی علاج کرتے ہیں پھر ''داد و ویکسین'' پاتے ہیں۔ ہمارے وصی شاہ ان سے اس لیے متاثر ہیں کہ ڈنگی ان کی تحریروں کی ایسی صحت خراب کرتا ہے کہ اس کا علاج کوئی بام عروج پہ پہنچا ماہر عروض بھی نہیں کرسکتا۔ کیونکہ ڈِنگی نام ہے اعتماد۔ سردار سدھو سنگھ ڈنگی اپنی کتابوں کے نام یوں بدل کر رکھتے ہیں مثلاً

بھیگیں آنکھ جاتی ہیں--- جو چربہ ہے
آنکھیں بھیگ جاتی ہیں--- کا
آنکھیں بھیگ جاتی ہیں کا نہیں ٹانگ جاتی ہے۔ سردار سدھو سنگھ ڈنگی نے اپنی ایک اور کتاب کا نام یہ رکھا

کاش میں تیرے کنگنوں کا ہاتھ ہوتا ----
جو چربہ ہے--- کاش میں تیرے ہاتھ کا کنگن ہوتا

ایک اور کتاب--- تجھے چٹول دھواں دوں گا
جس کا آسان ترجمہ ہے--- تجھے ڈھول چٹا دوں گا

''خطاں اوساں ہو گئے ہیں''
جو تبدیلی ہے ''اوساں خطا ہو گئے ہیں'' کی
طوطے کے ہاتھوں اُڑنا
اس کا اسلوب تو اب آپ خود بھی سمجھ سکتے ہیں

علی رضا احمد

ان کی ہائیکو کی کتاب ''لگ بھگ'' سمیت لگ بھگ کئی کتابیں چھپ چکی ہیں جو ساری کی ساری لگ بھگ کی طرح ''رنگ بھنگ'' ہیں - اپنی کتابیں ''مدِ نظر'' اور ''حدِ نظر'' کو خطرات میں دیکھتے ہوئے انہوں نے پندرویں کتاب ''بدِ نظر'' سب سے پہلے چھپوائی۔ان کا موٹو تھا ''سب سے پہلے کتاب'' کتاب چھپوانے کا طریقہ صرف انہیں آتا ہے اور ہر پبلشر ان کی ہر کتاب چھاپنے کے لئے تیار رہتا ہے کیونکہ پبلشر اس کی سائکی سمجھ چکے ہیں اور یہ پبلشرز کی -ہر کسی کو معلوم ہے پبلشر نئے لکھنے والوں اور نئی تحریروں کو گھاس نہیں ڈالتے اس لیے یہ کتاب کے نام کو نیا تڑکا لگا کر انہیں رام کر لیتے ہیں- جیسے ان کی کتاب کا نام اداس نسلیں بولڈ سا نظر آتا ہے اس کے ساتھ چھوٹا سا لکھا ہوتا ہے چڑیا گھر کی — یوں ''چڑیا گھر کی اداس نسلیں'' ان کی اعلیٰ نسل کی کتاب ہے -ان کی ایک اور کتاب کا نام راجہ گدھ ہے ساتھ باریک لکھا ہے بھارت کے- یوں ''بھارت کے راجہ گدھ'' ناولوں میں نمبر — ون گنا جاتا ہے-ان کی تین صد صفحات پر مشتمل کتاب کا پورے بھارت میں بہت چرچا رہا جس کا نام تھا ''دگڑ دگڑ'' کتاب کے انتساب کے نیچے کچھ نہیں لکھا تھا لیکن ایک جانور کی فوٹو تھی اور اس کا آغاز یوں ہوا تھا:

نیا کٹا کھلا نگر در نگر

دگڑ دگڑ دگڑ ہی ڈگڑا اور پھر یہ دگڑ ڈگڑ کی تحریر تین سو صفحات عبور کر گئی اور کچھ دگڑ دگڑ ان جھولی میں بھی آن پڑے-

ایک مشاعرے میں ان کی صدارت رکھی گئی سامعین ان کے آنے کا انتظار کرتے رہے لیکن یہ آنے سے گریزاں تھے-وہ اس لیے کہ انھوں نے بوتل ہوٹل اور تناول کی شرط رکھی تھی- سارے لوگ ان کی خوراک سے آگاہ تھے کہ جتنا کھاتے ہیں اس زیادہ ہی کھاتے ہیں-ان کی ساری شرائط مان کر انہیں لایا گیا- کھانے کے لیے پوچھا گیا کون سی ''فوڈ'' کھائیں گے کہنے لگے جو مرضی ہے منگوا لیں- کسی نے مشورہ دیا ہاتھی کی سونڈ روسٹ کروا لیں اور کسی نے اپنی دانست کی مطابق کچھ اور مشورہ دیا بحرحال اسی وقت ان کے سامنے Lame روسٹ فوڈ پانڈا کے ذریعے منگوانے کا آرڈر کیا گیا- چند منٹوں میں آدھا Lame اکیلے پانی کے ساتھ ڈکار کر کہنے لگے تم نے تو پانڈا روسٹ منگوایا تھا ''یہ کیا لے کر آ گئے ہو'' میں نے تو پانڈا روسٹ کا موڈ بنا لیا تھا اٹھا لو اسے - منگوانے والوں نے اس بارے میں کچھ مجبوریاں بیان کیں تو بلند آواز سے کہنے لگے میرے ساتھ Lame excuses نہیں چلیں گی بحرحال اسی وقت مکمل پانڈا روسٹ کا آرڈر دیا گیا پھر کہیں ان کی جان میں جان آئی-اس وقت ان کی طرف دیکھ کر ایک شاعر نے کہا:

تم کو دیکھا تو یہ خیال آیا
زندگی میں تو نے گھنا کھایا

.....

ان کی کوشش ہوتی ہے کہ اپنی غزلیں سود پر دے دیں ایک شاعر نے تنگ آ کر ایک ایسی ہی سود یافتہ غزل تتی کر کے انہیں ہی لگا دی تھی لکھاری عام طور پر اپنا تخلص خود اپنی مرضی سے طبیعت اور کیفیت کے مطابق رکھتے ہیں لیکن ڈگی کو تخلص محلے داروں اور دوستوں نے ان کی ذات کا بغور مطالعہ کرتے ہوئے گفٹ کیا اور انھوں نے اسے بخوشی قبول بھی کر لیا تھا کیونکہ کوئی بھی ان سے چھیڑ خانی کرے تو وہ چھیڑنے والے سے زیادہ خود تفریح لیتے ہیں کیونکہ طبیعتاً یہ ایسے ہی ونگے ہیں۔ نا صرف پیدائشی لیفٹ ہینڈڈ ہیں اور ہر کام الٹے ہاتھ سے کرتے ہیں لیکن سیدھا معدے سے سوچتے ہیں مگر سارے محاورے الٹے بولتے ہیں جب یہ پورے اعتماد سے کہیں گے چور کے تنکے میں داڑھی تو کیا لوگ انہیں لوگ سدھو کہہ کر بلائیں گے؟ نہیں کبھی نہیں، وہ لازمی طور پر ساتھ سردار سدھو سنگھ ڈنگا بھی لگائیں گے---

ویسے دل کے برے نہیں ہیں اگر کوئی انہیں کسی قسم کا Gift دے تو اس گفٹ پر آدھا گھنٹہ ''gift گو'' کرتے ہیں اور مزید گفٹ کی تاکید بھی ''چھچھڑوں کو بلی کے خواب''

دنیا کے ہر کونے میں نئے کٹے کھل رہے ہیں۔ انھیں اس بات پر بڑا غرور ہے کہ بچپن میں یہ اپنے گاؤں کا ہر پرانا کٹا اپنے بائیں ہاتھ سے کھولنے کا ورلڈ کپ بھی جیت چکے ہیں۔ ''سر کا غرور نیچا'' ظاہر ہے اس موضوع پر ان کی ایک کتاب بھی ہے۔

زندگی میں صرف ایک دفعہ ان سے نیا کٹا کھولنے کی غلطی سرزد ہوئی تھی مگر دوبارہ انہوں نے ہاتھوں کو کان لگا لئے اور گاؤں والوں نے بھی توبہ کر لی کہ آئندہ اسے کبھی کھلا نہیں چھوڑنا۔ ''چور کے تنکے میں داڑھی'' جیسے ہی اس نے چلچلاتی دوپہر میں ایک نیا کٹا کھولا تو مستریوں نے اسے رنگ برنگے ہاتھوں سے پکڑ لیا دریں اثنا اسی مضروب کٹے کے منہ پر کالک مَل کر--- اور اِسے اسی کٹے پر بٹھا کر گاؤں کے چکر لگوانا شروع کیے جب یہ اپنے گھر کے سامنے سے گزرا تو اس کی بیوی نے اس کو گلے میں پڑے جوتوں سے پہچان لیا اور پست آواز میں شور ڈالنے لگی'' بھاگتے لنگوٹ کی چوری ہی سہی'' ڈگی بیوی سے کہنے لگا پریشان نہ ہو بس دو گلیاں رہ گئی ہیں تم چائے کا پانی رکھو میں یہ کٹا وہیں باندھ کر آتا ہوں جہاں سے کھلا تھا۔ لہٰذا صبح کا بھولا لوٹ کے سدھو گھر آ گیا۔ اب جہاں بھی کوئی نیا کٹا کھلتا ہے چھاپہ اس کے ہاں پڑ جاتا ہے کیونکہ

''بدنام اور بدنام برا''--- چھوڑیں ہمیں اس سے کیا؟ جٹ جانے یا بجو جانے--- خیرو کی ماں کب تک خیر منائے گی۔

ان کا مختصر تعارف یہ ہے کہ 15 اگست 1947 کو مشرقی پنجاب کے ایک گاؤں

سدھا پٹھہ کے باہر سحر اندھیرے میں پیدا ہوئے اس "حساب" سے عمر ستتر اعشاریہ 17 سال ہو چکی ہے۔ والدین نے نام تو سدھور کھا اور اس امید کے ساتھ کہ ان کی قسمت کی لیکھائیں جلد سیدھی ہو جائیں گی اور ان کی زندگی کو بھاگ لگے رہیں گے لیکن سدھو نے سب کچھ ڈنگا کر کے رکھ دیا۔ ڈنگے نے ایک کمال یہ کیا کہ ایک سال کی عمر میں پہلے سیدھا چلنا شروع کیا لیکن پھر گھٹنوں پر آ گئے اور رڑنا شروع کر دیا۔

جب ڈھیرہ سال کی عمر میں بولنا شروع کیا تو پہلا جملہ یہ بولا باپو جی کیا ہم آزاد ہیں؟ باپو نے فوراً کہا گوروں سے تو ہم ہو چکے ہیں مگر ڈیڑھ برس سے ہم مقدر کے غلام ہو چکے جب سے تم پیدا ہوئے ہو اب ہمارے گھر کا راستہ تو ڈا کیا بھی بھولنے لگ گیا ہے اور ساتھ ہی یہ جملہ داغ دیا۔

کنگا کچھا اور کیس گرپان
سیدھے ہو گئے ڈنگے پلان

.....

باپو نے ہاتھ جوڑ کر کہا اچھا ہوتا اگر تو دو تین سال کے بعد بولنا شروع کرتا اور ہم تمہاری الٹی سیدھی باتوں اور حرکتوں سے محفوظ رہتے اور رشتہ داروں سے بے عزت نہ ہوتے۔ سردار سدھو سنگھ ڈنگی سے نہ صرف ہر کام الٹا ہو جاتا ہے بلکہ ان کی تحریر بھی الٹی سیدھی آگے پیچھے ہو جاتی ہے اور ان کی تعریف میں پڑھے جانے والے "مزاح مین" بھی۔ جب سے سوشل میڈیا آیا ہے یہ مشہور ہونے کے لیے شاید جان بوجھ کر بھی ایسا کرنے لگے ہیں اور اس لئے بھی کہ ان کے لائیکس اور ویوز دن بدن بڑھتے جا رہے ہیں۔

ان سے کسی نے پوچھا کہ آپ کے بہت سے لطیفے مشہور ہیں۔ رونی صورت بنا کر کہنے لگے سارے سچے واقعات ہیں کسی نے بددیانتی کرتے ہوئے ان کو لطیفوں کا رنگ دے دیا ہے۔ اس نے دوبارہ پوچھا مثلاً؟ کہنے لگے ایک دفعہ بازار سے گزرتے ہوئے وہ کسی شئے سے ٹکرا گئے اور سر بری طرح پھٹ گیا۔ لوگ اکٹھے ہو کر پوچھنے لگے سردار جی کیا ہوا؟ الٹا ان سے پوچھنے لگے کیا یہ سائن بورڈ نظر آ رہا ہے؟ سب نے کہا ہاں نظر آ رہا ہے۔ ادھر ایک اور سردار جی بھی کھڑے تھے ان سے علیحدہ پوچھا کیا آپ کو بھی نظر آ رہا ہے۔ اس نے نہایت سخت لہجے میں مہذب سی گالی دے کر کہا کس کو نظر نہیں آ رہا؟ کہنے لگے "لو جی مجھے نظر نہیں آیا" ایسے دردناک واقعات کے لطیفے بنانا ویسے بھی بداخلاقی ہے۔ ان سے پوچھا گیا وہ کیا ہے جو زمین پر پڑا نظر آتا ہے مگر میلا بھی نہیں ہوتا کہنے لگے میرا۔۔۔ سایہ۔۔۔ ڈنگی کبھی کبھی نہا بھی لیتا ہیں کیوں کہ یہ واش اینڈ ویئر پروڈکٹ ہے۔۔۔ کہتے ہیں میں پرتھوی کا ایک برانڈڈ ڈنگا ہوں لیکن اپنے مدمقابل ڈنگے کو سنبھل

کر سیدھا کر دیتا ہوں۔

اب تو بات یہاں تک پہنچ چکی ہے کہ کوئی لکھاری ان پر مضمون لکھے تو اس کا قلم بھی سلپ ہو جاتا ہے اور اس کے الفاظ بھی آگے پیچھے ہو جاتے ہیں اور وہ ہانگ کانگ کو کانگ ہانگ لکھ دیتا ہے۔

1992 میں ایک گورے کے ساتھ ان کی تو تو میں میں ہو گئی اور یہ ویزا لگوا کر اس کے پیچھے لندن پہنچ گئے تا کہ وہاں جا کر اس کی ہوم گراونڈ میں تو تو میں میں کا ورلڈ کپ جیت کر آئیں۔ کیونکہ اس چھچھڑے کو بلیوں کے خواب پہلے ہی آ رہے تھے وہاں یہ اس گورے کی تلاش میں تو ناکام رہے مگر ایک افریقن عورت سے شادی کر بیٹھے اور اس وقت سے ان کی میں میں تو تو کی چیمپئن ٹرافی جاری ہے۔ بیوی لیفٹی ہے اور لفتی بھی اور یہ دونوں اپنی جگہ رائٹ ہیں مگر اب یہ دونوں مل کر گوروں کی مرچوں میں بھی آنکھیں ڈالنے لگے ہیں کیونکہ یہ پنجابی مکس انگریزی بولتے ہیں۔ ''ڈھنڈورا بغل میں بچہ شہر میں'' ایک دفعہ ان کا یہی بچہ بیمار ہوا اسے ڈاکٹر کے پاس لے گئے اور ڈاکٹر سے کہنے لگے۔ ذرا میرے روبن سنگھ کو چیک کریں۔ نا اے Eat دا ---- نا ای Drink دا ---- بس weep دا ای weepدا --- ڈاکٹر بھی سردار جی تھے کہنے لگے --- سردار جی اینا نئیں worry ہوئی دا --- کل تک Okay ہوئے گا بس اسے appleلاں تے orangجاں داجوس پلاؤ --- ادھر بھی ''پھیکے کی دکان میٹھا سا پکوان'' مل جاتا ہے ---

بچپن میں ان کو کئی قسم کے پیشہ ورانہ کاموں میں ڈالا گیا لیکن سب کے سب ''سیکھ'' کر کامیابی سے بھاگ نکلے۔ شروع میں ان کو دندان سازی کے کام پر ڈالا گیا۔ مریض ان کو دیکھتے ہی دانت نکالا کرتے تھے۔ یہ بھی ان کے دانت کھٹے کرنے کا موقع ہاتھ سے جانے نہیں دیتے تھے۔ انھوں نے ایک منجن بھی تیار کر رکھا تھا۔ جس کے بارے میں ان کا دعویٰ تھا کہ یہ سر کا چکاتا ہے اگر سر پر رگڑا جائے تو .... کارپینٹر کا کام بہت جلد سیکھ گئے تھے اس لئے وہاں کے مکھ منتری نے اپنی اسمبلی کی کیبنٹ کی تیاری بھی ان کے سپرد کر دی تھی لیکن یہ کچن کیبنٹ کے خوف سے بھاگ نکلے۔ پھر ان کو اسی سے ملتے جلتے کام یعنی انھیں حجام کے سپرد کیا گیا لیکن یہ استرا لئے ہاتھ میں پکڑ کر ایسا لہراتے تھے کہ لوگ شیشے میں دیکھ کر سہم جاتے تھے کیونکہ ''استرا تو ہوتا ہے اس طرح کے کاموں میں'' یوں کئی گاہک الٹا ان کی حجامت کی کوشش میں ہوتے تھے کیونکہ یہ انھیں بال بڑھانے کا درس دیتے تھے۔ چنانچہ گھر والوں نے اندازہ لگایا کہ ''کالے میں کچھ دال ہے'' بلآخر انھیں گرم حمام استرے سمیت بھاگنا پڑا۔ یہ بڑے فخر سے کہتے ہیں کہ میں اس کے بعد کبھی کسی گرم حمام کے پاس سے بھی نہیں گزرا۔ یوں میں

نے اپنی زندگی میں ایک بڑی رقم بڑی صفائی سے بچائی ہے مزید یہ کہ میری چھوٹی موٹی حجامت وغیرہ تو محلے دار کر دیتے ہیں اگر ہر مہینے بارہ سو بھی بچاؤں تو پچھلے ساٹھ سالوں میں ساڑھے آٹھ لاکھ بچا چکا ہوں۔ سب کے خیال میں اس کا نام ڈنگا سنگھ پختی ہونا چاہئے تھا۔ بچت کے بارے میں ان کی بات انکم ٹیکس والوں کے علم میں آ گئی انھوں نے انھیں نوٹس بھیج دیا۔ لیڈی انسپکٹر کے پاس جا کر کہنے لگے:

میں اتنا جو کھل کھلا رہا ہوں
آنکھیں تم سے ملا رہا ہوں
بیلنس جو کم ہے بینک میں اب
کیا مال ہے کیا دکھا رہا ہوں

.....

اب انھیں شعروں اور مشاعروں کا اتنا شوق نہیں رہا لیکن مشاعروں میں ان کو اپنی صدارت اور ''سردارت'' کا گھمنڈ ضرور ہوتا ہے۔ لوگ منے بال لگواتے ہیں انھوں نے شاید پر لگوا رکھے ہیں یہ ہر مشاعرے میں اُڑ کر پہنچ جاتے ہیں اور پر بھی کانوں کے اطراف میں لگوا رکھے ہیں یوں محسوس ہوتا ہے کہ یہاں منہ اٹھا کے آ گئے ہیں یوں کئی شاعر یہ گمان کرتے ہیں جیسے انھوں نے مشاعروں کا ایم ٹیگ لگوا رکھا ہو۔ ''کام کے نہ کاج کے دشمن سماج کے'' ایک منتظم مشاعرہ کو مشاعرے میں شرکت کے لیے بارعب انداز میں کہنے لگے مجھے شرافت اور اعزاز کے ساتھ مشاعرے میں بلائیں ورنہ دیکھوں گا آپ مشاعرہ کیسے کرتے ہیں بعد میں پتا چلا کہ وہ اپنے ان دونوں دوستوں کے گروپ کے ساتھ آنا چاہتے ہیں۔ آج کل پیسوں کے معاملے میں بھی بڑے محتاط ہیں اپنی بیوی کو کہنے لگے مجھے شام والی چائے نا شتے ہی میں دے دو اور ناشتے والا سامان ڈنر کے لیے رکھ لو۔ لوگ شوگر فری چائے پیتے ہیں مگر ان کی چائے سے اندازہ ہوتا ہے کہ اس ملک میں شوگر فری ملتی ہے---

ایک دفعہ اس نے اپنے ایک رشتہ دار سردار باہروں سنگھ باروی کا قطعہ تبدیلی کے بعد یوں سنا دیا:

آپے سی کے کپڑے پایئے
پنگڑے پی کے دارو پایئے
Sorry لکھنے والے پر بھی اس کا اثر آ گیا
دارو پی کے پنگڑے پایئے
ڈانگاں پھڑ کے میلے چلیئے
نال شریکاں چگڑے پایئے

.....

اب انھیں بار بار اس کی فرمائیں کی جاتی ہے کہ سردار جی اپنا قطعہ ''ان لا'' سنائیں۔ ایک دفعہ منیر نیازی (مرحوم) الحمرہ ہال میں اپنا مشہور کلام ہمیشہ دیر کر دیتا ہوں سنا رہے تھے انھوں نے جیسے ہی شروع کیا ''ہمیشہ دیر کر دیتا ہوں'' ہال سے آواز آئی دوسرے نکاح کو تو دیر نہیں لگائی--- بقول سردار سدھو سنگھ ڈنگی اسے کہتے ہیں ''سر سوں پر ہتھیلی جمانا''

☆☆☆☆☆

فیصل زمان چشتی / ایک ادبی بہشتی

مجھے اچھی طرح یاد ہے جب حلقہ ارباب ذوق مختلف ٹھکانوں سے صبر شکر کے گھونٹ پی کر اپنے آخری ٹھکانے الحمرا ادبی بیٹھک سے اُٹھ کر واپس جائے ولادت پاک ٹی ہاؤس آیا تو حلقے میں موجود، جو مددگار چہرے نظر آئے، اُن میں فیصل زمان چشتی کا چہرہ سب سے نمایاں، روشن اور باعتماد تھا۔ یہ پاک ہاؤس میں ایسے چپکے چپکے داخل ہوتا جیسے چوری کرنے آ رہا ہو۔ پھر ادھر ادھر دیکھ کر یکدم دبے پاؤں سڑھیاں چڑھتا اور کسی خفیہ ایجنسی کے مخبر کی طرح قریبی کرسی پر بیٹھ جاتا، بس حاضری رجسٹر ڈ سے پتہ چلتا ہے اس بے حس و حرکت بندے کا نام فیصل زمان چشتی ہے۔

یہ رجسٹر ڈ پر دستخط کرنے سے پہلے اوپر سے نیچے تک ہر نام اور موبائل نمبر کو بغور دیکھتا، پھر اپنا نام لکھتا پھر مجھے دیکھتا پھر اپنا موبائل نمبر لکھتا پھر مسکرا کر مجھے دیکھتا پھر دستخط کرتا اور یوں جلدی سے رجسٹر ڈ واپس کرتا ہے جیسے اس نے جعلی نام اور نمبر لکھا ہو۔

حلقہ ارباب ذوق کے اجلاس میں فیصل زمان چشتی جس کرسی پر باقاعدگی سے بیٹھتا تھا وہ کرسی اسٹیج کی جانب سے دیکھنے میں آخری کرسی نظر آتی پھر یوں ہوا کہ یہ دیکھتے ہی دیکھتے بلکہ روکتے ہی روکتے بغیر کوئی کرسی بدلے سیدھا اسٹیج کی پہلی کرسی پر آ بیٹھا، اور حلقہ ارباب ذوق کا جوائنٹ سیکرٹری بن گیا اور یوں پہلے میرا اور علی نواز شاہ کا اُستاد بن کر، فرحت عباس شاہ کا شاگرد بن گیا اور صرف شاگرد ہی نہیں بلکہ ایسا منہ چڑھا شاگرد جو استاد کو استاد جی نہیں بلکہ شاہ جی کہتا ہے۔

اور پھر شاہ جی کہنے کو اس طرح نبھاتا ہے کہ فرحت عباس شاہ کے مخالفین کو واضح پیغام دیتا ہے کہ ٹھیک ہے فرحت عباس شاہ صاحب تہنوں پسند نئیں کر دے پر تسی بکواس نئیں کرنی، میں سنبھال لاں گا۔

اعجاز رضوی

اگر کوئی لڑکی فرحت عباس شاہ کی مخالفت کرے تو پہلے اسے غور سے دیکھتا ہے پھر دل ہی دل میں مخاطب ہوتا ہے۔ میرے وس دی گل نئیں۔

تُسی اینج نہ کرو، شاہ جی نال گل تے کرو باقی میں سنبھال لاں گا۔

فیصل زمان چشتی نے حلقہ ارباب ذوق کے ہفتہ وار اجلاس کی تفصیلی رپورٹ لکھنے میڈیا پر میڈیا نے اور احباب کو خبر انے کا فریضہ یوں ادا کیا ہے کہ لگتا ہے کسی زمانے میں یہ بادشاہ اکبر اعظم کا منشی اعظم رہا ہے۔ یہ طبیعت کا بہت نرم ہے، یہ ہی وجہ ہے کہ کوئی دوست واش روم جانے کا کہے تو یہ فوراً اپنی گاڑی لے آتا ہے، کوئی شاعر ادیب واش روم سے آواز لگائے کہ پانی چاہیے تو یہ فوراً مخاطب ہوتا ہے، یار تسی وڈے شاعر ادیب ہو پانی کیوں، میں طہارت واسطے ٹھنڈی کوک لے کے آناواں۔

فیصل زمان چشتی کی گاڑی باقاعدہ ادبی ریل گاڑی ہے اس پر اکثر ادبی سامان کے ساتھ ساتھ فرحت عباس شاہ کی ترسیل بھی کی جاتی ہے جہاں اکثر مشاعروں میں شاعر اپنے تازہ کلام لے کر آتے وہاں فیصل زمان چشتی فرحت عباس شاہ کو لے کر جاتا ہے فیصل یوں چلتا ہے جیسے خود کو زور لگا کر چلا رہا ہو۔

اس کا ایک شعر ہے:

ایسے چلتا ہوں میں دل کی پکڑ کر انگلی
جیسے بیمار کو لے کر کوئی بیمار چلے

.....

اس شعر کو مجسم دیکھنا ہو تو اس وقت دیکھیں جب یہ فرحت عباس شاہ کے ساتھ چل رہا ہو۔ ان کو چلتے ہوئے دیکھ کر لگتا ہے یہ فرحت شاہ کو دکھا کر لوگوں سے پیسے مانگ رہا ہے۔ اس کا رنگ روپ ایسا ہے کہ لونگی بنیان پہن لے تو بنگالی مولوی لگتا ہے اور اگر نیکر بنیان میں نظر آئے تو ریٹائر باکسر دکھتا ہے۔ تھوڑا سا بڑھا ہوا پیٹ اس بات کا ثبوت ہے کہ یہ اپنے زیادہ تر کام بیٹھ کر کرتا ہے۔ اس کا ہیر سٹائل کسی کلفی والے مرغے سے ملتا ہے۔ بے تکلف دوستوں سے بات کرے تو پُر جوش انداز میں اللہ اکبر، اللہ اکبر کہتا ہے، اچھے شعر سن کر منہ بنا لیتا ہے کبھی کبھی منہ یوں بناتا ہے جیسے کھٹا پی رہا ہو۔ فیصل زمان چشتی کا آبائی شہر میاں چنوں ہے۔ اس لیے یہ مشاعرہ پڑھتے ہوئے دونوں ہاتھوں کا استعمال یوں کرتا ہے کہ باقاعدہ میاں فیملی کا شاعر لگتا ہے، اور جب دوستوں سے مل رہا ہو ایسی گفتگو کرتا ہے کہ بلکل چنوں لگتا ہے۔ میاں چنوں ملتان اور شیخوپورہ کی نسبت سے اس نے تعلیم مکمل کی۔ ایم اے اُردو پھر ایم اے اکنامکس اور پھر ایم بی اے کیا، مگر بات چیت دیہاتی انداز میں کرتا ہے، اس نے تین ہی شعری مجموعے تخلیق کیے۔ فیصل زمان چشتی ریڈیو چینل ایف ایم 95 پر کافی عرصے سے برائے ایصال ثواب کام کر رہا ہے اور یہ ہی ثواب وہ حلقہ ارباب ذوق سے بھی حاصل کر رہا ہے۔

فیصل زمان چشتی کے سامنے کسی کام کی ابتدا کرو تو یہ بہت غور سے دیکھتا ہے پھر بلند آواز میں کہتا ہے یار لگے رہو، میں تہاڈے نال آں..... یہ لفظ صرف قول فیصل ہی نہیں ایک مکمل پیکیج ہے اور اس پیکیج میں تمام ادبی ورکر کے لیے کھانے پینے کے ساتھ ساتھ، پک اینڈ ڈراپ کی سہولت بھی موجود ہے اور مزہ دار باتوں کا پیکیج الگ سے ہے، یہ آپ کو پک اینڈ ڈراپ کرتے ہوئے دو طرفہ گفتگو کرتا ہے کبھی لطیفہ سناتا ہے کبھی خبر اور پھر اسٹیئرنگ پر ہاتھ جما کر منہ آپ کی طرف موڑ کر پیٹ کے بل یوں ہنستا ہے کہ ڈر کے رونے کو دل کرتا ہے، یہ کہتا ہے گلاں کردے سفر دا پتہ نہیں چلدا۔ اسی لیے گاڑی میں بہت باتیں کرتا ہے۔

فیصل زمان چشتی کسی زمانے میں پینٹ شرٹ بھی پہنتا تھا، جس دن سے اُسے پتہ چلا ہے کہ اب اس کے ناپ کی بیلٹ نہیں ملتی، اس نے شلوار قمیض پہننی شروع کر دی ہے، کبھی کبھی رکھے ہوئے کوٹ کو اپنے فربہ بدن پر فٹ کر لیتا ہے اگر بیگم اس کو زیادہ سمارٹ سمجھے تو فوراً کوٹ کے بدلے، واسکوٹ پہن لیتا ہے۔ یہ حلقے میں تنقید کے لیے پیش کی گئی، شاعری پر یوں کھل کر گفتگو کرتا ہے جیسے اپنی شاعری پر بول رہا ہو یہ حلقے کے مشاعرہ میں اپنا کلام بھی یوں مزے لے لے کر سناتا ہے جیسے گل نوخیز قسم کی شاعرہ کو متاثر کر رہا ہو۔ حالانکہ سامنے علی نواز شاہ ہوتا ہے۔

فیصل زمان چشتی اچھے اچھے نقادوں سے زیادہ اچھے تنقیدی اور تحسینی مضمون لکھتا ہے اور خوب داد پاتا ہے۔ یہ اردو ادب کا ایمرجنسی نقاد ہے، ویسے بنیادی طور پر یہ عاشق مزاج اور خلقت پسند شاعر ہے یہ جب کسی نوجوان خاتون سے بات کرے تو کہتا ہے، ہور سناؤ، خیریت اے میں فیصل زمان چشتی مکمل تیاری نال مخاطب آں کل تشریف لے آؤ، کھلا مشاعرہ ہے، آپ غزل پڑھیں، نظم پڑھیں، ویسے میں تے مرثیہ پڑھن تے وی راضی آں۔ بس تسی پڑھ دیو۔ حلقے کی مجلس عالمہ کی طرف کوئی پیغام ہو تو کہتا ہے۔

صدر محترم اعجاز رضوی صاحب تہاڈی اجازت نال تہاڈی ماواں بہناں، نوں وی میسج کروا دتا اے۔ عزت دا سوال اے تُسی بھی زور پا دیو، آ جائیں تو فیر موجاں ای، موجاں۔

فیصل زمان چشتی کی موجیں بھلے کس طرح بھی ہوں پر یاروں دوستوں کی موج بہار تو اس کے دم قدم سے ہے۔

میں نے کہیں پڑھا تھا کہ بت پرستی کا دوسرا نام خود پرستی ہے جب تک بندہ خود پرستی کے فریب سے نہیں نکلتا وہ انسان نہیں بن سکتا۔ یہاں میں اس قول کو 26 ویں آئینی ترمیم کے بعد، یوں رقم کر رہا ہو کہ جب تک بندہ بت پرستی اور خود پرستی سے نہیں نکلتا۔ وہ فیصل زمان چشتی نہیں بن سکتا اور جو فیصل زمان چشتی بن جائے۔ اسی بندے کو ہم ادبی بہشتی کہہ سکتے ہیں، سو میں کہتا ہوں، نعرے فیصل زمان چشتی اور آپ کہیں زندہ باد، ادبی..... بہشتی

☆☆☆☆☆

غزل

گیت سے گیت کی بالی پھوٹی، دانے دانوں سے نکلے
سنگ کی قید سے چھوٹے چشمے، تیر کمانوں سے نکلے

دروازوں نے آنکھیں جھپکیں، آوازوں نے پٹ کھولے
کیسے جمیل جلیل دن آئے، چاند مکانوں سے نکلے

نکتہ نکتہ کتاب ہوئے ہیں، نکتہ نکتہ دیکھ ہمیں
کیسے کیسے گل کس رت میں، کتنے بہانوں سے نکلے

کتنی صبحیں کالی کر دیں، کتنے بال سفید کیے
خون کی آگ میں جلتے کاغذ آتش دانوں سے نکلے

نیندوں نیندوں دن ہو جائیں، جاگتے جاگتے سو جائیں
شام اذانوں کی رہ دیکھے، دن بھی اذانوں سے نکلے

بوند نے اپنی مٹھی کھولی، چار طرف پر پھیل گئے
ایک پرندہ مٹھکا بھڑکا، رنگ اڑانوں سے نکلے

آج تو آج کے دکھ کافی ہیں، کل کے چھل، کل دیکھیں گے
کیسے کیسے زہری جملے، گنگ زبانوں سے نکلے

نئے گھڑے کی مٹی تھے ہم، ایک ہی لہر میں لہر ہوئے
ہم سے شراب چناب کے کھوے کب مے خانوں سے نکلے

سورج خوشبو ہو جائے گا، چاند لہو ہو جائے گا
کلیانوں کی بات نہ جانے کب کھلیانوں سے نکلے

کس کے گھر کی چمنی دن بھر کتنا دھواں اگلتی ہے
پیٹ کا ایندھن بننے، بچے، کوہستانوں سے نکلے

ہر پتھر میں ایک ہی صورت، ہر صورت میں ایک ہی روپ
اللہ اللہ کرتے خالد سب بت خانوں سے نکلے

خالد احمد

غزلیں

احساسِ وطن یہاں نہیں ہے
کوئی بھی سخن ، بیاں نہیں ہے

ہر شخص بجائے اپنی ڈفلی
ملت کا تو پاسباں نہیں ہے

دل ہی دل میں جلے ہیں سب لوگ
یہ آگ دھواں دھواں نہیں ہے

اب باپ سے کیوں ہے بیٹا ناراض
جب ماں سے تو بدگماں نہیں ہے

ہے ایک نشان پہ ٹھکانہ
جب دھیان یہاں وہاں نہیں ہے

ہے پاک وطن کی جان ثاقب
کب خون یہ گل فشاں نہیں ہے

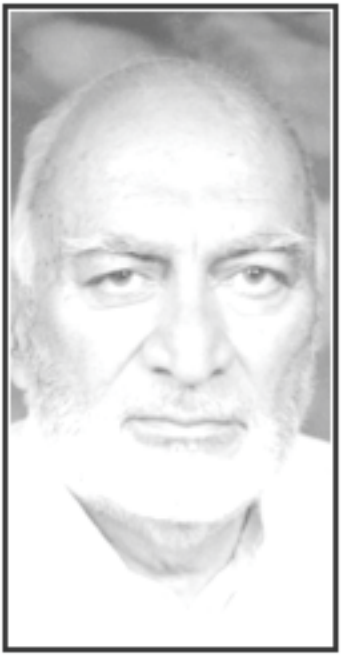

آصف ثاقب

اُسے کاغذ پہ لکھا جا رہا تھا
جو میرا گیت گایا جا رہا تھا
اُسے روکا ہے کیوں بستی کے لوگو
ہمارا یار اچھا جا رہا تھا
اُسے ٹوکا تو ہے بے جا ہنسی پر
مگر وہ شخص ہنستا جا رہا ہے
جدھر ہم دیکھتے ہیں آنکھ بھر کر
ادھر پھولوں کا کھارا جا رہا تھا
بھروسا کس پہ کرتا آنکھ والا
جب اس کا دل تو مارا جا رہا تھا

ہم اپنی آن میں ٹھہرے ہوئے تھے
ہمارا وقت بھاگا جا رہا تھا
براتی خوش بخوش جانے لگے ہیں
دولہن لے کر ''شوہالہ'' جا رہا ہے
اکیلا جا چکا کشتی پہ ثاقب
وہ جس کے ساتھ دریا جا رہا تھا

غزلیں

جو دیکھتی نہیں آنکھیں وہ بات دیکھتا ہوں
سیاہ رات میں دن، دن میں رات دیکھتا ہوں

یہ کل جہاں کبھی ذرہ دکھائی دے، تو کبھی
اک ایک ذرے میں اک کائنات دیکھتا ہوں

سلگتے رہتے ہیں جس کے سبب یہ جان وجگر
اسی فراق میں دل کی نشاط دیکھتا ہوں

کبھی کسی کے بیانوں پہ مَیں نہیں جاتا
لگی ہوئی ہے کدھر کس کی گھات دیکھتا ہوں

غبارِ غیظ میں اس کو کہاں دکھائی دے
میں صاف صاف مگر اس کی مات دیکھتا ہوں

جلیل عالی

یہ کیا کہ روز سرنئے قدموں سے جا لگے
خود سے جو کچھ بڑا نظر آئے خدا لگے

تاریخ کیسی کیسی دھنک دھول کر گئی
وہ بھی غبار ہو گئے جو دیوتا لگے

طائر ہوں، آبشار ہو، بارش ہو، باد ہو
سب کے سُروں میں ایک وہی بولتا لگے

اوروں کو اپنے حال دگر کی ہو کیوں خبر
جی پر بنی ہوئی سے زمانے کو کیا لگے

تری صلاح میں دِکھتا نہیں ہے دم، لیکن
ترے کہے پہ یہ پُونی بھی کات دیکھتا ہوں

عدو کی سازشیں کرتی ہیں اور دل مضبوط
مگر جب ان میں خود اپنوں کا ہاتھ دیکھتا ہوں

کھڑا ہوں ایسے مقامِ نگاہ پر عالی
جہاں سے فرش و فلک ایک ساتھ دیکھتا ہوں

اِس وہمگی کا کیا ہو مداوا کہ ہر سخن
اپنے خلاف ہی مجھے جاتا ہوا لگے

اُس رُوسیہ کے دورِ ہمہ جَور کے لیے
اک حرفِ نامزا نہیں جو ناروا لگے

عالی اگر نہ پاس ہو کہنے کو کچھ الگ
طرزِ ادا میں ہی کوئی پہلو جدا لگے

غزل

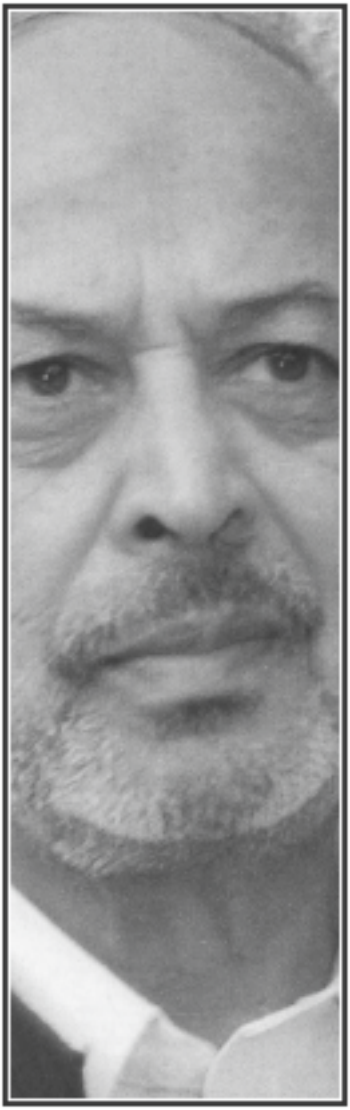

وہ آئنہ ہے مگر اس میں دلبری نہ رہی
کہ چاند تاروں میں پہلی سی روشنی نہ رہی

اسی زمین میں ہم نے بھی خواب بوئے تھے
وہی زمیں ہے مگر اس میں وہ نمی نہ رہی

ہمارے عہد کا یہ سانحہ رقم تو ہوا
رہے گی جس کی ضرورت وہ آگہی نہ رہی

قدم ہمارے بھی پہلے سے تیز تر اُٹھے
سکون و صبر و تحمل کی زندگی نہ رہی

ہر ایک شخص کی اپنی کتھا ہے کیا کہیے
ملے وہ رنج کہ یاروں میں خوش دلی نہ رہی

ہم آدمی ہیں مگر دل میں کھوٹ رکھتے ہیں
ہمارے عہد میں اب قدرِ آدمی نہ رہی

فریب و مکر سے دامن چھڑا سکے نہ حسن
ہوئے ہیں سجدے بہت روحِ بندگی نہ رہی

حسن عسکری کاظمی

غزل

آسمانوں پہ اچھالے ہوئے ہم تھے ہی نہیں
خوش نصیبی ترے پالے ہوئے ہم تھے ہی نہیں

زور بازو سے کیا پار سمندر شب کا
اس کی موجوں کے سنبھالے ہوئے ہم تھے ہی نہیں

ہر قدم ساتھ رہا سر پہ دہکتا سورج
چاند تاروں کے اجالے ہوئے ہم تھے ہی نہیں

عمر بھر ہوتی رہی دانۂ گندم کی تلاش
جیسے جنت سے نکالے ہوئے ہم تھے ہی نہیں

آج تک ہم نے کیا یاس کے صحرا سے گریز
اس کی وحشت کے حوالے ہوئے ہم تھے ہی نہیں

رزق امید کی دنیا سے لیا جتنا لیا
اپنے حالات کے پالے ہوئے ہم تھے ہی نہیں

آنے والے کئی موسم ہیں حوالہ اپنا
اس طرح سوچنے والے ہوئے ہم تھے ہی نہیں

اشک پیتے ہوئے غم کھاتے ہوئے بیت گئی
زندگی تیرے حوالے ہوئے ہم تھے ہی نہیں

کتنے بے سمت اشاروں پہ کنور چلتے رہے
اپنی دانست میں ڈھالے ہوئے ہم تھے ہی نہیں

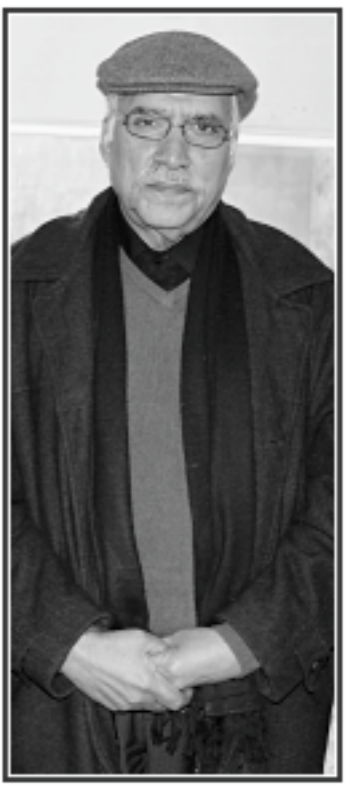

اعجاز کنور راجہ

غزل

کچھ نہیں جھوٹے دعائق سے تعلّق میرا
صلح نامے کی کسی شِق سے تعلّق میرا

تیری خاطر ہی یہاں ہوتا ہے آنا اکثر
ورنہ اِس شہرِ منافق سے تعلّق میرا؟

عمر بھر خاک کے خیمے میں رہا میرا قیام
تھا تو جنّت کے حدائق سے تعلّق میرا

یہ الگ بات کہ شیریں سُخنی ہے مُجھ میں!
ہے بڑے تلخ حقائق سے تعلّق میرا

جانے کیوں مُجھ کو مسلمان بنا ہی نہ سکا!
اتنے ارکان و مناسِک سے تعلّق میرا

اہلِ مغرب مُجھے تسلیم کہاں کرتے ہیں؟
جرم یہ ہے کہ ہے مشرق سے تعلّق میرا

راز کی بات ہے، کیسے مَیں بتاؤں کیا ہے
اُس دریچے میں پڑی چِق سے تعلّق میرا

سب سفر سمتِ مخالف میں رہے ہیں میرے
کچھ نہیں بادِ موافق سے تعلّق میرا!

ہارنے والا سپاہی ہوں، کوئی مت پوچھے
کیا ہے غرناطہ کے طارق سے تعلّق میرا

وعظ پر وعظ کیے جاتا ہے جو بے چارہ
کیا کسی ناصحِ مشفق سے تعلق میرا!

اور اب میرے سبھی حرف ہی بے جاں ٹھیرے!
مستند سارے دعائق سے تعلّق میرا!

کیا کسی اَور پہ ظاہر کروں یہ بھید نسیم
جانتا ہوں جو ہے خالق سے تعلّق میرا

نسیمِ سحر

غزل [عبدالرحمٰن انجم کی نذر]

وہم کے ماروں سے ہوتا ہے برسوں میں
اہل یقیں سے کام ہوا جو لمحوں میں

اپنے گھر کو بے تدبیری مار گئی
بکھرا ہوا ہے ایک اک کر کے تنکوں میں

ہم نے اپنا من مندر ویران کیا
سج دھج لیکن خوب ہے اپنے سجدوں میں

غم سامانی کب سے ماہ و سال میں ہے
روز افزوں برسات سجی ہے آنکھوں میں

ساکت جامد لفظوں سے سرشار ہوئے
فن کے نام پہ زہر پلایا قصوں میں

آنکھ سے پٹی کھل جائے تو بات بنے
دیکھ سکیں گے دشمن بیٹھے گھاتوں میں

بھولی بسری یاد سہانی آتی ہے
ہجر کی لمبی اور طوفانی راتوں میں

مطلب برآری نے کاٹا الفت کو
غیریت کی بو در آئی سانسوں میں

راہ سلامت ایک ریاض کی رہ جائے
میرے یار کا ہاتھ رہے جو ہاتھوں میں

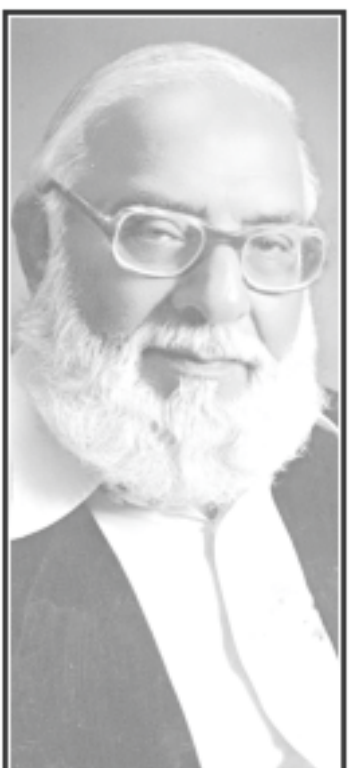

سید ریاض حسین زیدی

غزل

حُسن بھی عشق بھی ، ہر چیز تھی فانی تیری
کس طرح رہتی کوئی پاس نشانی تیری

چھان بیٹھا ہوں تجسّس میں یہ گرُدوں سارا
اِک ستارے سے نہیں پوچھی کہانی تیری

اِک سفینے میں گزر آیا ہُوں میں اے دریا
غور سے دیکھی نہیں مَیں نے روانی تیری

میں ہوں غمگین، شجر بھی ہیں دکھی اے پنچھی
دل پہ اِک بوجھ بنی نقل مکانی تیری

چند لمحوں میں نہیں جاتی تھکن عمروں کی
لے کے مَیں کرتا بھی کیا شام سہانی تیری

اُڑ چکے رنگ سبھی ، نقش ہیں دھندلے دھندلے
ہے مگر یاد وہ تصویر پرانی تیری

اپنی ہی دُھن میں دعا دیتا گزر گلیوں سے
رنگ لائے گئی کبھی اشک فشانی تیری

نثار ترابی

غزل

کسی سے رابطہ ٹوٹا ہوا ہے
ابھی تک آئنہ ٹوٹا ہوا ہے

مرا گھر دور کیا ہے دوستوں سے
کہیں سے راستہ ٹوٹا ہوا ہے

نئے رشتوں پہ آمادہ نہیں دل
پرانا سلسلہ ٹوٹا ہوا ہے

ہمیں پاسِ ادب ہے کچھ زیادہ
ہمارا دل ذرا ٹوٹا ہوا ہے

وہی تم ہو وہی میں بھی ہوں، لیکن
ہمارا حوصلہ ٹوٹا ہوا ہے

کسی سے عہد ٹوٹا ہے کچھ ایسا
جگر میں تیر سا ٹوٹا ہوا ہے

وہ کوزہ گر ہے اتنا باخبر ہے
کہ ثابت کیا ہے، کیا ٹوٹا ہوا ہے

رضی میں بھی ہوں ریزہ ریزہ لیکن
وہ مجھ سے بھی سوا ٹوٹا ہوا ہے

صفدر صدیق رضی

غزل

دیر ، اِن آنی جانیوں میں رہے
وقت کی ناگہانیوں میں رہے

عمر بھر خوش گمانیوں میں رہے
ہائے ، کِن گہرے پانیوں میں رہے

اپنا ہی بھید ہم پہ کھل نہ سکا
کیسے کیسے نہ گیانیوں میں رہے

مار دینے کی جن میں قدرت تھی
ہم بھی کِن ناتوانیوں میں رہے

اک بکھرتے وجود میں سمٹے
وقت کے امتحانیوں میں رہے

بے تعارف سہی ، مگر پھر بھی
ساری سنگت نشانیوں میں رہے

کس نے جانا ہے ، کس نے پہچانا
ہم کہ اوّل ، نہ ثانیوں میں رہے

جو بھی قصّے کہانیاں تھی سنیں
اُن ہی قصّے کہانیوں میں رہے

زندہ رکھ رکھ جو مار دیتے ہیں
دیر ، اُن یار جانیوں میں رہے

طارق بٹ

غزل

دنیا نہیں کسی کی بہت خوش گماں نہ ہو
کیا ہو جہاں خلوص کا نام ونشاں نہ ہو

سینے میں دل ہے دل میں ہے آتش فشاں کوئی
وہ آگ جل رہی ہے کہ جس کا دھواں نہ ہو

آ بیٹھ پاس اپنے کہ تجھ کو خبر تو ہو
ہم ہی اگر نہ ہوں تو یہ بزم جہاں نہ ہو

پنچھی بھی آدمی کی طرح سوچتے تو ہیں
کوئی نہیں کہیں کا اگر آشیاں نہ ہو

میں سوچتا ہوں حیرتیں ویرانیوں کی دوست
کوئی مکیں نہ ہو جہاں کوئی مکاں نہ ہو

پھر کون دشمنی میں گرے گا زمین پر
یعنی کہ سر پہ میرے اگر آشیاں نہ ہو

کیا چاہنے میں ہوتا ہے چاہا تھا ہم نے بھی
ہم دونوں ہوں کہیں تو کوئی درمیاں نہ ہو

کیا خوب ہے کہ سعد محافظ بھی میرے ہیں
لیکن ہے خوف ایسا کہ بس لاگماں نہ ہو

سعد اللہ شاہ

غزل

سرخ یاقوت سی گلاب ہے وہ
لالہ گوں آتشی گلاب ہے وہ

آنکھ بھر دیکھ تو سہی اس کو
پھول ہے واقعی گلاب ہے وہ

کہکشاؤں کی زینتِ ضوبار
کوکبِ مشتری گلاب ہے وہ

رات دن ایک سا مہکتی ہے
لالۂ خاوری گلاب ہے وہ

عشق مہکار سے معطر ہے
خارجی داخلی گلاب ہے وہ

سب رتوں کی نشان دار کلی
غنچۂ سرمدی گلاب ہے وہ

چھو رہا ہوں خیالِ نازک سے
ناشکیبائی سی گلاب ہے وہ

ساحرانہ جمال رکھتی ہے
حیرتِ سامری گلاب ہے وہ

میرے مرقد پہ اس کی یاد کھلے
ضوفشاں دائمی گلاب ہے وہ

خاکساری پہ ناز ہے اصغر
چونکہ خاکستری گلاب ہے وہ

علی اصغر عباس

غزل

جو حل ہر مسئلہ ہونے لگا ہے
تو کیا اب وہ خدا ہونے لگا ہے

اسے کہیے سُرور و کیف و مستی
اسے دیکھا، نشہ ہونے لگا ہے

اب ایسی بھی تنک خوئی بھلا کیا
دعا پر بھی خفا ہونے لگا ہے

یہ کیسا انقلاب الفت میں آیا
روا ہر ناروا ہونے لگا ہے

سنبھالو اب نظام بزم ہستی
جہاں تم پر فدا ہونے لگا ہے

یقیں آ جائے گا کیا اہل دل کو
جفا خُو با وفا ہونے لگا ہے

پریشاں تھا، صدا آئی: نہ گھبرا
کہ پورا مدعا ہونے لگا ہے

وہ کیا آئے گلوں کے رنگ نکھرے
گلستاں کا بھلا ہونے لگا ہے

یہ کیا ہے نارسائی کا تسلسل
کوئی دل سے جدا ہونے لگا ہے

وہ ساجد آ رہے ہیں میرے گھر میں
یہ کیا محشر بپا ہونے لگا ہے

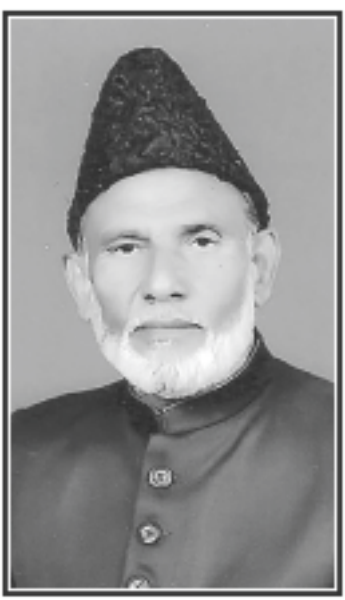

شریف ساجد

غزل

کہیں رستہ بنانا اور کہیں دیوار ہونا
بڑا مشکل عمل ہے آئنہ بردار ہونا

زمانے بھر کی سننا، سوچنا اور دل جلانا
عذاب جاں ہوا ہے ذہن کا بے دار ہونا

تمہارے راستے آسان کرتا جا رہا ہوں
یہی ہوتا ہے خود سے بر سر پیکار ہونا

اسی کو زندگی کہتے ہیں بس اتنا سمجھ لو
کہانی میں تمہارا بھی کوئی کردار ہونا

خدا کا شکر ہے معصومیت قائم ہے اب تک
خدا کا شکر ہے، آیا نہیں ہشیار ہونا

مری مشکل یہی ہے اس قدر آسان ہوں میں
بہت آسان ہوتا ہے قمر دشوار ہونا

اقبال قمر

غزل

خاک سے عرش بنانے میں لگے ہیں مجھ کو
رات دن ساتھ گھمانے میں لگے ہیں مجھ کو

اپنی آنکھیں نہ کہیں پھوڑنا پڑ جائیں انہیں
وہ جو منظر سے ہٹانے میں لگے ہیں مجھ کو

جانتے ہیں نہیں مٹتی کبھی پتھر کی لکیر
لوگ کچھ پھر بھی مٹانے میں لگے ہیں مجھ کو

کاش وہ دیکھ سکیں میرے بدن کے گھاؤ
اپنے جو زخم دکھانے میں لگے ہیں مجھ کو

یہ تو بتلائیں کے اس کی کوئی تعبیر بھی ہے
آپ جو خواب دکھانے میں لگے ہیں مجھ کو

اس قدر دور نکل آیا تھا خود سے اک دن
دن بہت لوٹ کے آنے میں لگے ہیں مجھ کو

میں اگر سویا ہوا ہوتا تو اٹھ بھی جاتا
جانے کیوں آپ جگانے میں لگے ہیں مجھ کو

میرے لہجے میں نظر آتے نہیں کیا راحت
زخم جو دل کے لگانے میں لگے ہیں مجھ کو

راحت سرحدی

غزل

خون آنکھوں میں جو اترا ہے وہ پی سکتا ہوں؟
اور اک بار، اجازت ہے، میں جی سکتا ہوں

ابھی باقی ہے تعلق کی فضاؤں میں ہوا
تری تحریر میں نقطہ تو کبھی سکتہ ہوں

ہر قرائت میں ادھڑ جاتے ہیں لفظ و معنی
کیا میں اس چاک بیانی کو بھی سی سکتا ہوں؟

ڈوب کر بھی تری آنکھوں میں ابھی پیاسا ہوں
جام اک اور محبت کا بھی پی سکتا ہوں

میں جو سانسوں کے جنازوں میں پنپتا ہوں انیم
خاک اور آگ کے مرقد میں بھی جی سکتا ہوں

ابو طالب انیم

انتخاب

- خالد احمد -

نعمان منظور

ہر سخن تھا ہم اہلِ غم کے لیے
دل شکن ، دل خراش ، دل آزار

غزل

دُنیا پلٹ پڑی مری تاخیر دیکھنے
میں رُک گیا تھا پاؤں کی زنجیر دیکھنے

گرتا ہوا لہو بھی وہیں مل گیا مجھے
میں تو گیا تھا چلتا ہوا تیر دیکھنے

تیری گلی میں کوئی تجھے دیکھتا نہیں
رہ گیر آتے جاتے ہیں رہگیر دیکھنے

دروازہ توڑ کر کوئی آیا، چلا گیا
آیا ہو جیسے بس مری تصویر دیکھنے

مشعل دکھا دکھا کے اندھیرے کو چلتا جاؤں
تیری فصیل پر پڑی شمشیر دیکھنے

مجھ کو پھر آج لوحِ زمانہ پہ شک ہوا
میں پھر سے چل پڑا تری تحریر دیکھنے

شاہین عباس

غزل

اسی لیے تو اجالوں کو جستجو ہے مری
کسی ستارۂ روشن سے گفتگو ہے مری

تری اداس نظر جھلملا اُٹھے، اے کاش!
ہرا بھرا تجھے دیکھوں یہ آرزو ہے مری

غبار ہو کے ادا کر دیا تلاش کا حق
میں دربدر ہی سہی خاک سرخرو ہے مری

مقابلہ ہے نئے دور کے یزیدوں سے
خدائے پاک! ترے ہاتھ آبرو ہے مری

یہاں تو کھلنا ہی ناقابلِ معافی تھا
مزید جرم کہ خوشبو چہارسو ہے مری

جوازِ حرف و صدا، جانِ کائنات غزل!
بھرے جہان میں آئینہ دار تو ہے مری

کچھ اس لیے بھی توقع نہیں رعایت کی
کہ آج پیشی خود اپنے ہی روبرو ہے مری

کسی پہ کھل نہ سکا رازِ چاک دامانی
بڑے غضب کی ہنرکاریٔ رفو ہے مری

حقیقتوں کا بھی کرتا ہوں سامنا ڈٹ کر
یہ مانتا ہوں طبیعت فسانہ جو ہے مری

لرزتی ہے صفِ سیارگاں جسے سن کر
وہ اور کچھ بھی نہیں اک صدائے ہو ہے مری

سخن سے تختِ سلیماں تو مل نہیں سکتا
یہی بہت ہے پذیرائی کو بہ کو ہے مری

میں سوتے جاگتے جس کی نظر میں ہوں انصر
وہ آنکھ کتنی قریبِ رگِ گلو ہے مری

سید انصر

غزل

سفید ہو گیا سب کچھ سیاہ کوئی نہیں
درست دیکھنے والی نگاہ کوئی نہیں

خطائیں کرنے سے روکا نہیں گیا ہم کو
سزا سنائی گئی ، انتباہ کوئی نہیں

کہاں ہے آگ لگی ،کون جل کے راکھ ہوا
دھواں تو پھیلا ہوا ہے ، گواہ کوئی نہیں

کسی خیال کے نرغے میں آ گیا ہوں میں
یہاں سے زندہ نکلنے کی راہ کوئی نہیں

ازل سے راندۂ درگاہ ہوں زمانے میں
مرے لیے کوئی جائے پناہ ؟ کوئی نہیں

تعلق اپنی جگہ پر ضرور ہے ، لیکن
ہمارے درمیاں واضح نباہ کوئی نہیں

میں اپنے آپ سے لڑتا ہوں اس لیے شاہد
مرے علاوہ مرا خیر خواہ کوئی نہیں

شاہد اشرف

غزل

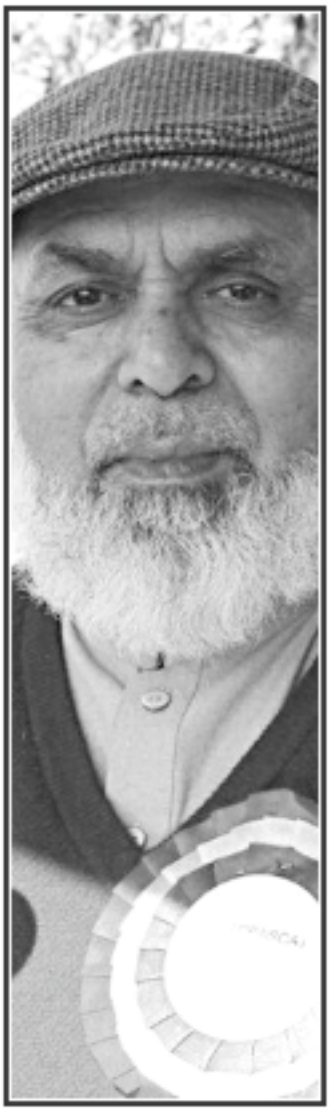

جتن کیے تھے بہت، جن کو پالنے کے لیے
وہی چلے ہمیں گھر سے نکالنے کے لیے

ہزار اچھے ہو تم، جتنا چاہے سچے ہو تم
مگر یہ دنیا ہے پگڑی اُچھالنے کے لیے

محبتوں میں مقدر کا داؤ چلتا ہے
کہیں دراڑ، کہیں رخنہ ڈالنے کے لیے

ہر اک کمالِ ہنر تشنہ کام ٹھہرا ہے
جمالِ یار کو شعروں میں ڈھالنے کے لیے

سنا ہے آج کریں گے خطاب ٹی وی پر
امیرِ شہر غریبوں کو ٹالنے کے لیے

ہمارا کام فقط اُن کو ووٹ دینا ہے
وہ آئے اپنا مقدر اُجالنے کے لیے

انیسِ جاں! میں بکھرتا چلا گیا آخر
کوئی نہ تھا مری مٹی سنبھالنے کے لیے

محمد انیس انصاری

غزل

شہر تو بے مکاں نہیں ہے
گھر مگر کوئی یاں نہیں ہے

شعلۂ ذات بھی عجب ہے
آگ ہے اور دھواں نہیں ہے

درد کی لیں دوا جہاں سے
شہر میں وہ دکاں نہیں ہے

سوچ کر گھر بنایئے گا
دشت ہے یہ مکاں نہیں ہے

جھوٹ ہیں اور بہت سے تاریخ
ایک تیرا بیاں نہیں ہے

طائرِ امن ہونٹ سی لے
یہ ترا گلستاں نہیں ہے

آج تو کھل کے بات کر لیں
سایہ بھی درمیاں نہیں ہے

خورشید ربانی

غزل

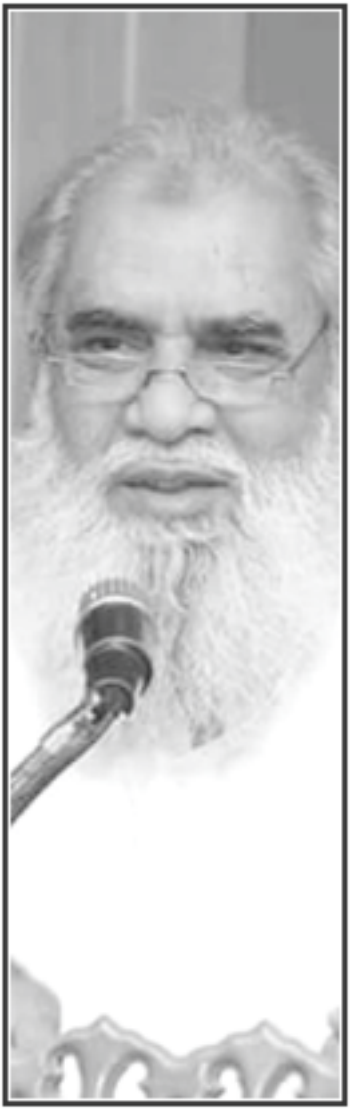

بچا لو گر بچا سکتے ہو تم دیوار ہونے کو
وگرنہ ہے یہ آنگن ایک سے اب چار ہونے کو

بتایا تھا کہ واں تیاریاں ساری مکمل ہیں
بتایا تھا عدو کی سمت سے ہے وار ہونے کو

اب اس جانب ہے کیا یہ تو ادھر پہنچے تو دیکھیں گے
ذرا تم حوصلہ رکھو ہے دریا پار ہونے کو

میاں اس راہ میں تو اس طرح ہوتا ہی رہتا ہے
یہ دل پر لے لیا تم نے تو اک انکار ہونے کو

عبادت کے لئے بھیجا گیا انسان دنیا میں
نہیں بھیجا تلاشِ رزق میں یوں خوار ہونے کو

جہاں ایسا ہوا تھا تو وہاں ایمان کامل تھے
کوئی تیار ہو جائے گا اب سنگسار ہونے کو

بہت خوش تھے جنہیں اپنوں کی تم تحویل میں دے کر
وہ سارے راز ہی اکرم ہیں اب اخبار ہونے کو

اکرم ناصر

غزلیں

اس طور میرے یار کو یاروں نے رد کیا
جیسے فلک کو چاند ستاروں نے رد کیا

نو واردانِ عشق تو ساحل پہ مر مٹے
دریائے آرزو کو کناروں نے رد کیا

اک پھول تھا جو حسن کی حدت نہ سہہ سکا
اک رنگ تھا جو شوخ نظاروں نے رد کیا

وہ درد جس کو سوز کی نعمت نہیں نصیب
وہ اشک جس کو گریہ گزاروں نے رد کیا

وہ شوق جس کے پاؤں میں چھالے نہیں پڑے
وہ راہ جس کو راہ گزاروں نے رد کیا

وہ خار جس کو پھول کا پہلو نہیں ملا
وہ باغ جس کو تیری بہاروں نے رد کیا

وہ گیت ہوں کہ جو کبھی گایا نہیں گیا
وہ لفظ ہوں کہ جس کو اشاروں نے رد کیا

ایسی بڑھی ہے لذتِ آزار دوستو
خود چارہ گر کو درد کے ماروں نے رد کیا

اس آستاں کو لاکھوں جبینیں ہیں دستیاب
جس آستاں کو چند ہزاروں نے رد کیا

افتخار شاہد

سرِ ساحل سفینہ آ گیا ہے
محبت کا قرینہ آ گیا ہے

حقیقت میں انہی کی زندگی ہے
جنہیں مرنا یا جینا آ گیا ہے

بچھڑنا راس آیا ہے تمہیں بھی
ہمیں بھی زہر پینا آ گیا ہے

تری آواز کی خاطر ترستی
سماعت کو پسینہ آ گیا ہے

جبینوں سے جھڑے جاتے ہیں سجدے
درِ اقدس کا زینہ آ گیا ہے

کہاں کے ہم بھی بخیہ گر تھے شاہد
مگر زخموں کو سینا آ گیا ہے

غزل

سب جانتے ہیں موت سے بھاری ہے زندگی
پھر بھی ہر اک کو جان سے پیاری ہے زندگی

اپنی کٹی ہے سانس کی سولی پہ ہی حیات
گزری کہاں ہے، ہم نے گزاری ہے زندگی

ساری حیات کھیل ہے بس جیت ہار کا
داؤ پہ سب لگے ہیں، جواری ہے زندگی

اس کا ہی نام زندہ و جاوید ہو گیا
جس نے کسی کے پیار میں ہاری ہے زندگی

مخلوق کو ہے لغزشِ آدمؑ کی یہ سزا
خالق نے جو زمیں پہ اُتاری ہے زندگی

سارے نہیں حُسینی، یزیدی بھی ہیں یہاں
نوری کہیں پہ ہے، کہیں ناری ہے زندگی

قرآن نے کہا اُسے مُردہ نہ سمجھیے
جس نے بھی حق کے نام پہ واری ہے زندگی

پَل پَل رگوں میں زہر اتارا گیا عقیل
سانپوں بھری حسین پٹاری ہے زندگی

عقیل رحمانی

انتخاب

- خالد احمد -

نعمان منظور

خوبیاں ناقدِ فن کیوں دیکھے
دشت کی آنکھ چمن کیوں دیکھے

غزل

جل رہے ہیں پیار کے سارے، مگر دیکھے گا کون
کب ہواؤں میں بسا، رنگِ سفر دیکھے گا کون

آسماں پر جب بنایا جائے گا میرا مکاں
پھر زمیں پر رہ کے میرے، بام و در دیکھے گا کون

کونج اپنے ساتھیوں سے دور جب ہو جائے گی
مڑ کے پیچھے اُس کی جانب رہگزر، دیکھے گا کون

باوفا لوگوں کی بینائی اگر کھو جائے گی
چاند کی پھر چاندنی کو، رات بھر دیکھے گا کون

بیل بوٹوں پر گزاری جا رہی ہے زندگی
جو پھلوں سے ہیں لدے وہ اب، شجر دیکھے گا کون

ہم نے اپنا فرض تھا سو کر دیا جو کہ ادا
اُلٹی سیدھی اور ٹیڑھی، یہ ڈگر دیکھے گا کون

چاند بھی اُس سے خفا ہے اور تارے بھی مگر
زیست کی بھٹکی ہوئی، شام و سحر دیکھے گا کون

تتلیوں کی شوخیوں پر بھی نظر رُکتی نہیں
جگنوؤں کے رنگ بھی ہیں سرخ، پر دیکھے گا کون

ظالموں نے ظلم کی تشہیر کر ڈالی اگر
زندگی کے مُسکرانے کی سحر دیکھے گا کون

رابطہ اقبال اُن سے کٹ گیا ہے اِس قدر
آ گیا اُن کا کبھی پھر، نامہ بَر دیکھے گا کون

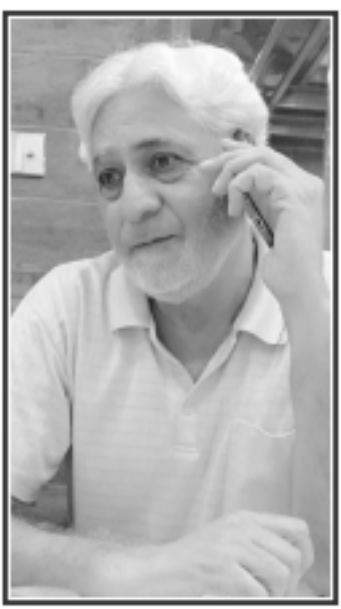

اقبال سروبہ

غزل

مسعود احمد

ہجر کے علاقے میں وصل کی دُکانیں ہیں
رات کے اندھیرے میں فجر کی اذانیں ہیں

دور ایک وادی میں چاند کا بسیرا ہے
راستوں کے جنگل میں بھربھری چٹانیں ہیں

کون بول سکتا ہے بھید کھول سکتا ہے
آپ کی حکومت ہے آپ کی زبانیں ہیں

تیر سارے ترکش کے اس نے توڑ ڈالے ہیں
جنگجو کو آگے سے گھورتی کمانیں ہیں

آپ کے شکاری ہیں آپ کی مچانیں ہیں
سارے سر تمہارے ہیں سب تمہاری تانیں ہیں

انتخاب

- خالد احمد -

نعمان منظور

ہجر نے ہم کو لازوال کیا
نفع دیتے ہیں کچھ خسارے بھی

غزل

نہیں وہ ترا نہ ہوگا کبھی وہ ترا نہ ہوگا
تو کہ یار کے تصور میں جو گم شدہ نہ ہوگا

بخدا نہ ہوگا ایسا کہیں خوشنما نہ ہوگا
مرے یار تیرے جیسا کوئی دوسرا نہ ہوگا

کسی اور سے محبت کوئی مسئلہ نہیں ہے
ترے بعد جو ہوا ہے کبھی پُر خلا نہ ہوگا

جسے چن لیا ہے میں نے جسے تج دیا ہے میں نے
کبھی مجھ سے دونوں پر ہی کوئی تبصرہ نہ ہوگا

وہ کہ یار کی جو قربت کے سرور میں بسا ہو
کہے خلد ہے زمیں پر تو غلط ذرا نہ ہوگا

ترے جسم میں جو لذت مرے رب نے رکھ دی جاناں
کسی شے میں اس زمانے کی یہ ذائقہ نہ ہوگا

مری ماں نے مجھ پہ یارو جو ہے مامتا لٹائی
مجھے غم ہے مجھ سے اس کا کبھی حق ادا نہ ہوگا

جو اُگا ہے میرے کمرے میں حسین تر ہے یارو
کہیں اتنا خوبصورت کبھی گل کھلا نہ ہوگا

ذکی طارق

غزل

آندھی نے ستم یہ بھی روا کر کے دکھایا
پیڑوں سے پرندوں کو جدا کر کے دکھایا

ہر آئنہ اس بات پہ ناراض ہے مجھ سے
قد میں نے ترا سب سے بڑا کر کے دکھایا

دنیا کو یقیں کب تھا ترے عہد و وفا پر
یہ پیڑ تو میں نے ہی گھنا کر کے دکھایا

سب تیری محبت کا کرشمہ ہے کہ جس نے
مجھ ایسے پرانے کو نیا کر کے دکھایا

میرے لیے بیکار تھا جو روزِ ازل سے
لوگوں نے وہ پتھر بھی خدا کر کے دکھایا

میں صرف دکھانے کے لیے تجھ سے تھا ناراض
اور تو نے حقیقت میں خفا کر کے دکھایا

بازار کے لوگوں کے ہیں معیار بھی ویسے
جب دل کیا کھوٹے کو کھرا کر کے دکھایا

سب اہلِ جنوں ششدر و حیران ہیں مجھ پر
یوں فرضِ محبت کا ادا کر کے دکھایا

تصویر میں سب ٹھیک دکھانا تھا سو اس نے
سوکھے ہوئے پیڑوں کو ہرا کر کے دکھایا

شمشیر چراغوں سے یہی سیکھا سو میں نے
ہر اپنے پرائے کا بھلا کر کے دکھایا

شمشیر حیدر

غزل

وہ ڈر ہواؤں کا اب کے دلوں میں بیٹھ گیا
دیے بجھے تو دُھواں طاقچوں میں بیٹھ گیا

میں ایسا خاک بسر تھا کہ تھک کے جب بیٹھا
غبارِ راہ مری جھرّیوں میں بیٹھ گیا

مریدِ مفلس و لاچار کی جگہ تھی یہی
برآمدے میں پڑی جوتیوں میں بیٹھ گیا

جو آیا تھا مرے سائے میں بیٹھنے کے لیے
ڈھلی جو دھوپ تو میری جڑوں میں بیٹھ گیا

تمھارا کرب سمجھتا ہوں میں اے دربدرو
مرا مکاں بھی گئی بارشوں میں بیٹھ گیا

میں قتل ہو گیا پہلے ہی سین میں سجاد
تو پھر سکوں سے تماشائیوں میں بیٹھ گیا

سجاد بلوچ

غزل

ہم نے سمجھا جسے محبت ہے
ہنس کے ملنا تو اس کی عادت ہے

اس کا لہجہ بتا گیا سب کچھ
دل میں اس کے ابھی کدورت ہے

چاند ٹھہرا ہے میرے آنگن میں
میرے دکھ سے اسے بھی نسبت ہے

شور کرتی ہے میری تنہائی
وقت ملتا ہے اب نہ فرصت ہے

گھر میں اترے ہیں کیسے سناٹے
شب میں پنہاں یہ کیسی وحشت ہے

ہنستے ہنستے ہی رو پڑی آنکھیں
ہم سے غم کی کچھ ایسی نسبت ہے

ختم ہو گا نہ یہ سفر اپنا
لکھی قسمت میں جب مسافت ہے

جانتے ہو عذاب در بدری؟
ہجرتوں میں بہت اذیت ہے

نائلہ راٹھور

انتخاب

- خالد احمد -

نعمان منظور

کیا کہوں شہرِ غزالاں کبھی دیکھا ہی نہ تھا
جانِ جاں! میں نے یہ زنداں کبھی دیکھا ہی نہ تھا

غزل

مصرعوں کی جھانجھروں میں پروئے ہوئے ہیں لفظ
شعروں کی بندشوں میں سموئے ہوئے ہیں لفظ

لفظوں سے کھیلتے ہوئے تخلیق مر گئی
گویا کہ اب سکون سے سوئے ہوئے ہیں لفظ

لکھی ہوئی ہے ہم نے عقیدت سے اک غزل
پاکیزگی کے ہاتھ سے دھوئے ہوئے ہیں لفظ

گم ہیں خیالِ یار میں، ہیں چاہتوں میں گم
یعنی خمارِ عشق میں کھوئے ہوئے ہیں لفظ

قرطاسِ سخن بھیگ گئی آنسوؤں کے ساتھ
افروز دل فگار ہیں روئے ہوئے ہیں لفظ

افروز رضوی

انتخاب

- خالد احمد -

نعمان منظور

ہجر کا غم کچھ اور ہے، آنکھ کا نم کچھ اور شے
زیرِ چراغ آگہی نورِ ہُنر نہیں تو کیا

غزل

افسردہ کیونکر بیٹھے ہیں انصار ہماری بستی کے
ہم سے بھی الجھتے رہتے تھے سردار ہماری بستی کے

اک شور ہے نگری نگری میں اِن مہ پاروں مٹیاروں کا
مشہور ہیں مشرق مغرب میں دلدار ہماری بستی کے

ہم لوگ اِنھیں کے لونڈوں پہ ہر چیز نچھاور کرتے ہیں
اِس بات سے شاید غافل ہیں عطار ہماری بستی کے

باغات کھلے ہیں پھولوں کے ہریالی ہے خوشحالی ہے
نظارے دیکھنے آ جاؤ سرکار ہماری بستی کے

کرتوت ہمارے ہی کیونکر دنیا کو دکھائی دیتے ہیں
ہم سے تو زیادہ پاپی ہیں دیں دار ہماری بستی کے

ہر کام اِنھیں کی مرضی سے بستی کے اندر ہوتا ہے
لوگوں کی خدمت کرتے ہیں بیکار ہماری بستی کے

دنیا تو ان کی اپنی ہے اور دین بھی اِن کے گھر کا ہے
رکھتے ہیں بنا کر واعظ سے میخوار ہماری بستی کے

اے سوچنے والے سوچ ذرا اُس گھر کی حالت کیا ہوگی
جس گھر کو دین سکھائیں گے بدکار ہماری بستی کے

سہہ سہہ کے زور وڈیروں کا بستی کے ہر شیروں کا
بستی سے نکلتے جاتے ہیں نادار ہماری بستی کے

یہ دور ہے اوچھے لوگوں کا اِس دور کی تم نہ بات کرو
اِس دور سے انصر اوجھل ہیں آزار ہماری بستی کے

انصر حسن

غزل

ہجر میں گزرے ماہ و سال حضور
کچھ تو اب کیجئے خیال حضور

فاصلوں کو سمیٹ لیں اب تو
رابطے کیجئے بحال حضور

بزم میں آپ نے نہ پہچانا
ہم کو اتنا سا ہے ملال حضور

آپ سا کوئی بھی نہیں ہے یہاں
آپ واللہ ہیں بے مثال حضور

مل گیا ہوں تمہیں مقدر سے
ہم سے ملتے ہیں خال خال حضور

کیا صلہ ہے یہی محبت کا
ہے وفاؤں کا یہ مآل حضور

کچھ نہ کچھ تو حضور فرمائیں
منتظر ہے مرا سوال حضور

دردِ الفت کے تم مسیحا ہو
کیجئے کچھ تو اندمال حضور

آپ نے تو کسر نہ چھوڑی تھی
بچ گیا ہوں میں بال بال حضور

پھنس گیا ہے خوشی سے اس میں جلیل
آپ نے جو بکھیرا جال حضور

احمد جلیل

غزل

زخم ایسے بدن میں رہتے ہیں
داغ جیسے کفن میں رہتے ہیں

یہ تعلق بہت پرانا ہے
آپ تو میرے من میں رہتے ہیں

بیٹھ جاتے ہیں دو گھڑی چل کر
عمر بھر کیوں تھکن میں رہتے ہیں

گاؤں جیسا مزاج ہے جن کا
شہر میں اور نہ بن میں رہتے ہیں

اس کا لہجہ غزل کی صورت ہے
ہم بھی شہرِ سخن میں رہتے ہیں

کوئی اپنا نظر نہیں آتا
ہم کسی کے وطن میں رہتے ہیں

ایک مدت سے ہیں الاؤ میں
ہم سلگتے چمن میں رہتے ہیں

محمد نوید مرزا

غزلیں

حیات، بُھول بُھلیّوں میں کٹ بھی سکتی ہے
جمی ہے گرد جو چہرے پہ ہٹ بھی سکتی ہے

وہ سنگدل ابھی ناراض ہے مگر اے دوست
قریب آ کے مجھی سے لپٹ بھی سکتی ہے

وہ جیت کر بھی رہی ہار کے مراحل میں
وہ تیرِ چشم سے بازی اُلٹ بھی سکتی ہے

ہزار دن کی کتھا داستان گو، نہ سُنا
کہ ایک شب میں کہانی سمٹ بھی سکتی ہے

جسے شکار ہے کرنا کسی درندے کا
ہدف پہ جا کے وہ گولی پلٹ بھی سکتی ہے

وہ جھیلتا ہی رہا ہے جہان بھر کا شور
مگر جو چیخ ہے سینے میں پھٹ بھی سکتی ہے

سمیٹ لو کسی گٹھڑی میں آفتاب کی دھوپ
یہ ایسی شے ہے جو لوگوں میں بٹ بھی سکتی ہے

آفتاب خان

دفورِ زہر جو موجود ہر نفس میں رہا
تو کب ہے فرق بھلا عشق اور ہوس میں رہا

یہ سارے لوگ تھے حمّامِ وقت میں عُریاں
ہر ایک فرد انا کے کسی قفس میں رہا

جسے میں عین جوانی میں چھوڑ آیا کہیں
وہ میرے سامنے آئندہ ہر برس میں رہا

متاعِ جان سمجھتا رہا تھا مَیں اُس کو
تو پھر ہُوا یُوں کہ وہ بھی نہ میرے بس میں رہا

زُباں پہ آج بھی اِک ذائقہ مچلتا ہے
کوئی خمار سا اب تک لبوں کے رس میں رہا

میں اپنے ہاتھ سے آئینہ توڑ بیٹھا ہوں
بہت دِنوں میں مرا عکس پیش و پس میں رہا

جو آج شام سے کچھ کچھ کہیں سُلگتا ہے
وہی شرار چھپا دِل کے خار و خس میں رہا

نہ ختم ہو گا کبھی دورِ آفتاب یہاں
یہ اک ستارہ ہمیشہ زمیں کی نس میں رہا

غزلیں

اہلِ جنوں ہیں، کاشفِ اَسرار ہم نہیں
لیکن، بدیلِ وقت سے ہم لوگ کم نہیں

کیا پوچھتے ہیں آپ، دلِ بے قرار کا
برباد سا نگر ہے یہ باغِ ارم نہیں

ہر چند، درد دل کی صدا دور تک گئی
لیکن ہمارے حال پہ وہ آنکھ نم نہیں

دنیائے آب و گِل کی سمجھ کس کو آئی ہے
جس کو کہیں وجود، وہ کم از عدم نہیں

ہر راہ رو سے منزلِ مقصود ہے خفا
رہبر کو اس کی فکر نہیں، کچھ بھی غم نہیں

مانا، نبھا رہے ہیں وہ عہدِ وفا، مگر
اب کے وہ التفات نہیں، وہ کرم نہیں

شوکت! جفائے یار کا شکوہ کریں تو کیوں
اہلِ وفا، ازل سے کیا زیرِ ستم نہیں؟

شوکت محمود شوکت

دورِ تیرہ شبی مٹائیں گے
ہم دیے پر دیا جلائیں گے
دوست، جتنا بھی آزمائیں گے
ہم کو ثابت قدم ہی پائیں گے
باغِ فردوس کی تمنا میں
ایک دھرتی نئی بسائیں گے
اہلِ دل کی سرشت ہے ایسی
زخم کھائیں گے، مسکرائیں گے
چاند تاروں سے روشنی لے کر
تیرگی کو سبق سکھائیں گے

دل کی دنیا اُجڑ گئی جن کی
خاک، دنیا سے دل لگائیں گے
جن سے دیکھا گیا نہ جلوۂ یار
وعدے الفت کے کیا نبھائیں گے
سونے والے کو ہم کریں بیدار
جاگتے کو جگا نہ پائیں گے
عہد اب تو کیا ہے یہ شوکت
نامِ الفت نہ لب پہ لائیں گے

غزل

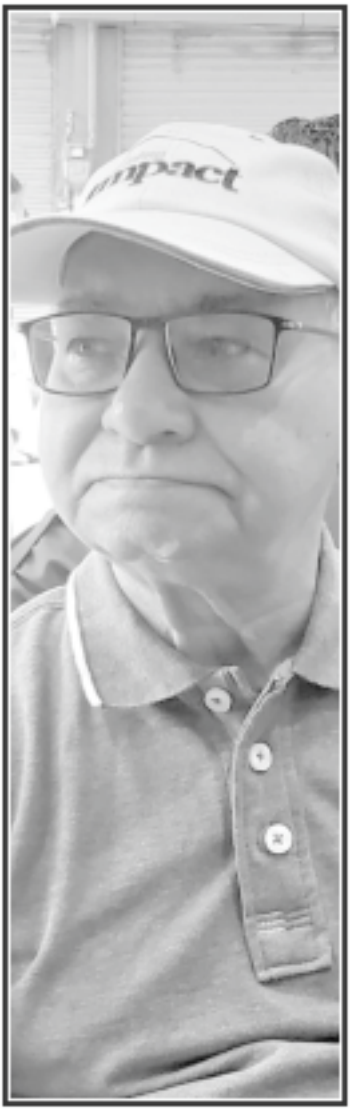

ٹھیک ہے تم کو گر نہیں آنا
جھوٹی قسمیں مگر نہیں کھانا

ٹھیک ہے تم کو بھول جائیں گے
تم بھی پھر خواب میں نہیں آنا

ٹھیک ہے اب نہیں ملیں گے کبھی
کیا کریں گے جو دل نہیں مانا

ٹھیک ہے ساتھ عمر بھر کا ہے
تجھ کو کھویا تو پھر نہیں پانا

ٹھیک ہے کہ بلائیں ہیں گھر میں
چھوڑ کر اپنا گھر نہیں جانا

ٹھیک ہے راستہ بدل لیں گے
تم بھی پھر سامنے نہیں آنا

ٹھیک ہے عشق نے کیا مدہوش
ہوش میں اب مجھے نہیں آنا

ٹھیک ہے دل سنبھال رکھ اعجاز
چوٹ گہری اگر نہیں کھانا

اجمل اعجاز

غزل

زندگی پوری سہولت نہیں دیتی تھی مجھے
آنکھ دیتی تھی، بصارت نہیں دیتی تھی مجھے

روشنی بن کے ترے ساتھ میں چل تو لیتا
میری رفتار اجازت نہیں دیتی تھی مجھے

میں ہی خاموشی سے ہر بات سمجھ لیتا تھا
وہ کسی شے کی وضاحت نہیں دیتی تھی مجھے

خود بخود بھرتا چلا جاتا تھا اندر کا خلا
کون سی چیز وہ عورت نہیں دیتی تھی مجھے

میں بھی جلنے کے لیے اس کے قریب آتا تھا
آگ بھی کوئی رعایت نہیں دیتی تھی مجھے

زخم بھی سینۂ سالار پہ اُگ آتے تھے
جنگ بس مالِ غنیمت نہیں دیتی تھی مجھے

شعر کہہ کر بھی میں خاموش رہا کرتا تھا
داد تک میری طبیعت نہیں دیتی تھی مجھے

حمزہ یعقوب

غزل

شبہ طراز

اگر دلیر ہیں اتنے ڈرے ہوئے کیوں ہیں
کسی کے بُغض میں ایسے بھرے ہوئے کیوں ہیں

اگر ہے مرنا تو قبروں میں جا کے لیٹ رہیں
سجا کے کتبے گھروں میں مَرے ہوئے کیوں ہیں

یہ کور چشم فقط ڈُگڈگی بجاتے ہیں
تماشہ گاہ میں تمغے دھرے ہوئے کیوں ہیں

بھرے گئے تھے سبھی وقت کی عنایت سے
یہ زخم میرے بھلا پھر ہرے ہوئے کیوں ہیں

جو دور سے مجھے پہچان کر لپکتے تھے
وہ پاس آ کے مِرے یوں پَرے ہوئے کیوں ہیں

کوئی تو بات تھی میرے کسی رویّے میں
جنم کے کھوٹے وگرنہ کھرے ہوئے کیوں ہیں

غزل

محمد اشرف کمال

وہ جتنی دیر میں اپنی کمان کھینچے گا
تڑپتے جسم کے اندر سے جان کھینچے گا

میں تم سے دور کسی دن چلا بھی جاؤں اگر
مجھے تمھاری طرف میرا دھیان کھینچے گا

مرے حروف گواہی ہیں میرے ہونے کی
زمانہ میری کہاں تک زبان کھینچے گا

مرے پروں کو کسی دن جو اس نے کھول دیا
مجھے پھر اپنی طرف آسمان کھینچے گا

اگر میں اس کے بجائے کسی کو دیکھتا ہوں
مجھے یہ ڈر ہے کہ وہ میرے کان کھینچے گا

مثالِ خوشبو وہ جائے گا آسماں کی طرف
مجھے بھی اپنی طرف خاکدان کھینچے گا

میں پانیوں کی تہوں پر رکھوں گا کشتی کو
ہوا کے زور کو پھر بادبان کھینچے گا

غزل

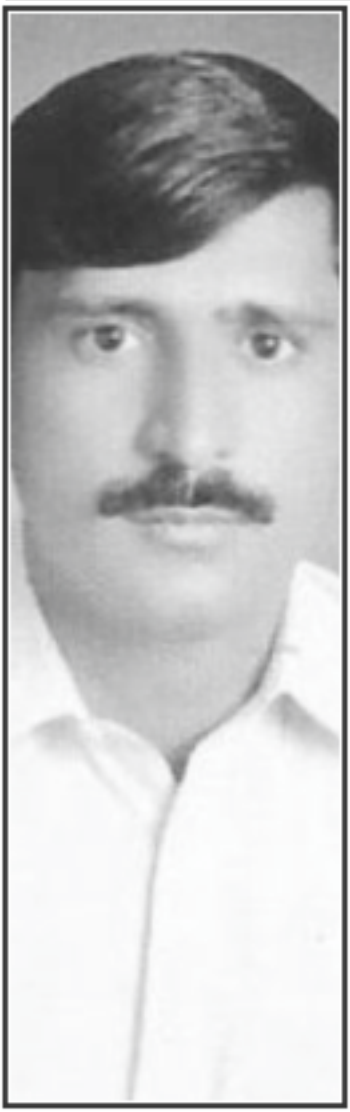

ہوا کو رازداں اپنا بنا کر دیکھ لیتے ہیں
اسے بھی داستانِ دل سنا کر دیکھ لیتے ہیں

یہ ممکن ہے بچھڑ کر جانے والا لوٹ ہی آئے
ہم اس کی راہ میں پلکیں بچھا کر دیکھ لیتے ہیں

سنا ہے ترکِ الفت بھی محبت کی ریاضت ہے
چلو اک بار اس کو بھی بھلا کر دیکھ لیتے ہیں

سنا ہے آتشِ ہجراں بجھانے سے نہیں بجھتی
چلو اشکوں کے پانی سے بجھا کر دیکھ لیتے ہیں

اسے دیکھے سے گر شاداں، دلِ ناشاد ہوتا ہے
تو اس کو جلوۂ جاناں دکھا کر دیکھ لیتے ہیں

اگر اپنی وفا پر ناز ہے اس کو سرِ محفل
چلو اک بار اس کو آزما کر دیکھ لیتے ہیں

اندھیروں سے اگر اعجاز دانش اس کو نفرت ہے
ستارے اپنی پلکوں پر سجا کر دیکھ لیتے ہیں

اعجاز دانش

غزل

اکرم سحر فارانی

ہم محبت عام کر دیں آ مرے ہمراز آ
بُلبلِ مہر و وفا ہے مائلِ پرواز آ

پھر کوئی نغمہ تراشیں ہم محبت کے لئے
بج رہے ہیں بزمِ دل میں دھڑکنوں کے ساز آ

دُنیا والوں کی نگاہوں میں محبت جُرم ہے
کُھل نہ جائیں اَب ہمارے رَتجگوں کے راز آ

تیرا پیکر میکدہ ہے میں پیاسا رند ہوں
سیکھ لیں پینے پلانے کے نئے اَنداز آ

بے وفاؤں سے وفاؤں کا تقاضا چھوڑ دے
کب کسی کو راس آئی ہے محبت باز آ

ڈھونڈتی پھرتی ہے تُجھ کو پھر مری دیوانگی
دل کی دھڑکن دے رہی ہے پھر تُجھے آواز آ

اَب ہمیں تنہائی کے لمحے میسّر ہیں سحر
ہم کریں گے اَب نئے اِک دور کا آغاز آ

غزلیں

یہ دورِ نگاہوں سے بھی رکھا نہیں جاتا
ہے منظرِ جاں ایسا کہ دیکھا نہیں جاتا

وہ سایا تھا سایوں میں کہیں ڈوب گیا ہے
بیٹھا ہے سرِ بام یہ دُھوکا نہیں جاتا

ہوتی ہے عیاں چہروں سے اظہار کی شدت
یہ عشق ہے میزان میں تولا نہیں جاتا

یہ عمرِ رواں کھینچ کے کس موڑ پہ لائی
سوچا نہیں جاتا کبھی لکھا نہیں جاتا

سیراب نہیں ہوتی ہیں فردا کی زمینیں
اِن حال کے دریاؤں کو روکا نہیں جاتا

خود آتے ہیں آدابِ جنوں غیب سے ناظر
یہ کارِ محبت کبھی سیکھا نہیں جاتا

اقبال ناظر

پیڑ کملایا ہوا پھر سے ہرا ہو جائے
اب کے خواہش ہے کہ تجدیدِ وفا ہو جائے

ہجر اور وصل کے نقشے کو برابر رکھے
ایک لمحے کو ملے، مل کے جدا ہو جائے

ایسی عزت نہیں جو بوئے غلامی ٹھہرے
ایسی توقیر نہیں ، بندہ خدا ہو جائے

یہ عجب شہر ہے کوفے کا چلن رکھتا ہے
راستی پر جو چلے اُس سے دغا ہو جائے

ایسے کوچے سے تو جنگل میں مکاں بہتر ہے
زندگی جس کے مکینوں کو سزا ہو جائے

دل کے دروازے کرو وا کہ نیا موسم ہے
دل کے شب خانے میں کچھ دیر ضیا ہو جائے

اہلِ دل سارے سخن ساز نہیں ہو سکتے
شاعری وصف ہے یہ جس کو عطا ہو جائے

خوف ناکامی کا مٹ جاتا ہے دل سے ناظر
شاملِ کار جو مولا کی رضا ہو جائے

غزل

یہاں بس دیکھتے ہیں کون کتنا شور کرتا ہے
سنی جاتی ہے اس کی جو زیادہ شور کرتا ہے

مجھے لگتا ہے میں پھر ہجر کے صحرا سے گزروں گا
مری آنکھوں میں پھر سے ایک دریا شور کرتا ہے

کبھی مجھ کو مری اپنی صدا تک بھی نہیں آتی
کبھی یہ دل مرے سینے میں اتنا شور کرتا ہے

تمہاری بے لحاظی سے یونہی دل میں خیال آیا
اگر کاسے میں سکے ہوں تو کاسہ شور کرتا ہے

نگلنے آتے ہیں جو اژدہے دکھتے نہیں ہم کو
مگر اک شاخ پر بیٹھا پرندہ شور کرتا ہے

چرا لوں خواب میں آئے ہوئے اس شخص کو میں تو
مگر میرے مقدر کا ستارا شور کرتا ہے

انھی کے قدموں کی آہٹ فلک سے آتی ہے سب کو
وہ جن کے خون میں پختہ ارادہ شور کرتا ہے

رگیں سارے بدن کی ٹوٹتی محسوس ہوتی ہیں
کچھ اتنے زور سے اس کا سراپا شور کرتا ہے

عجب نسبت کی دیکھی ہیں کرشمہ سازیاں عرفان
اتر کر تن سے بھی اس کا لبادہ شور کرتا ہے

عرفان صادق

غزل

زمیں سُلگتی نہ یہ آسماں سُلگتا ہے
چُھپا ہوا تہہِ امکاں، گماں سُلگتا ہے

رمق نہیں ہے بُجھی آنکھ سرد سینوں میں
تو کیسے لفظ کے اندر بیاں سُلگتا ہے

کسے بتاؤں کہ تعبیر اس کی کیا ہو گی
ہیں محوِ خواب مکیں اور مکاں سُلگتا ہے

جو آ ہی جاؤں کبھی نقرئی فضاؤں میں
درونِ جان کوئی ناگہاں سُلگتا ہے

کنارِ عُمر محبت کی لہر اُٹھتی ہے
سفر تمام ہوا بادباں سُلگتا ہے

ہوئی ہے شام سجا کر خوشی کو چہرے پر
جبیں کے بل سے، مرا سائباں سُلگتا ہے

وہ وقت پھر نہ کبھی آیا لوٹ کر روشن
کہ جس کی یاد میں سارا جہاں سُلگتا ہے

اعجاز روشن

غزلیں

ہم جس راہ پہ چل نکلے ہیں اس کے آگے کھائی ہے
دیکھتے دیکھتے دیکھو ہمیں تقدیر کہاں لے آئی ہے

اس کی سریلی درد بھری لے کتنے دلوں کو چیر گئی
بدن دریدہ سوکھی لکڑی کہنے کو شہنائی ہے

صدیوں کے انمول خزینے اس کی کوکھ میں ڈوب ہیں
کیسے کیسے گل چہروں پر جمی ہوئی اب کائی ہے

شب کو چاند نہیں نکلا تھا گہری گھور گھٹاؤں سے
ہوا چلی تو ایسے لگا تھا زلف تری لہرائی ہے

اس نے جس سے محبت کی تھی سدا اسی کا ہو کے رہا
باقی چاہنے والوں کی نظروں میں وہ ہرجائی ہے

راجہ عبدالقیوم

آتے وقت کا بے جا دھڑکا، جاتے وقت کا غم
آتے وقت میں تم کیا ہو گے اور کیا ہوں گے ہم

آتی بہاروں کی رنگینی جانے کیسی ہو گی
جانے کیسا ہو گا اب کے جاتے سمے موسم

رم جھم رم جھم جیسے برسی اس موسم میں برکھا
جانے پھر تب ایسے برسے، جب نہ ہوں گے ہم

کیا ہو جب ماضی ہو، حال ہو یا ہو مستقبل
سامنے ہوں سب جب ہم کہہ دیں کھل جا سم سم

غزل

نگارِ عشق ہے وہ آگ جل سکو تو چلو
ہمارے ساتھ اگر تم بھی چل سکو تو چلو

وفا کے فیصلے میں پیش و پس تو ٹھیک نہیں
تم اپنے دل کی یہ حالت بدل سکو تو چلو

تم آزماتے ہو مجھ کو سو میں بھی دیکھتا ہوں
مرے خلاف کوئی چال چل سکو تو چلو

یہ جانتے ہو ہمیں آس ہے اُجالے کی
چراغ بن کے اندھیرے میں جل سکو تو چلو

تمھیں خبر ہے؟ کوئی منتظر تمھارا ہے
تم اپنے آپ سے باہر نکل سکو تو چلو

ستم کے سانپ کو ہر روز پالنے والی
یہ اِک قدیم روایت کُچل سکو تو چلو

مقدر اپنا یہی ہے سو ہم تو جاتے ہیں
جنوں کے راستے میں تم بھی چل سکو تو چلو

کہیں ہیں پھول، کہیں خارزار ہے دُنیا
تم اپنی سوچ کا محور بدل سکو تو چلو

ترے بغیر وہ منزل بھی مل گئی تو کیا؟
بصد خلوص مرے ساتھ چل سکو تو چلو

منافقت سے تعلق ہمارا کچھ بھی نہیں
جو تم خلوص کے سانچے میں ڈھل سکو تو چلو

غزل برائے غزل میں کہاں کا لُطف نبیل
زمیں پُرانی ہے رستہ بدل سکو تو چلو

نبیل احمد نبیل

غزل

خالدہ انور

جب کہ ثابت ہے بے وفا تم ہو
پھر بھی کیوں شاملِ دعا تم ہو

میری ہستی کا مرکزہ تم ہو
باخدا تم ہو ، باخدا تم ہو

زندہ رہنے کا حوصلہ تم ہو
شبِ تاریک میں ضیا تم ہو

میرے ہر درد کا تمھی ہو سبب
اور ہر زخم کی دوا تم ہو

غمِ دنیا دماغ کی ترجیح
دلِ مضطر کا مسئلہ تم ہو

تم ہی تم ہو جدھر جدھر دیکھوں
گویا ہستی کا حاشیہ تم ہو

اِن دنوں جو خدا سے قربت ہے
سچ تو یہ ہے کہ واسطہ تم ہو

غزلیں

جب الجھنوں میں گھرا ہوں قریب جاتا نہیں
میں دوستوں کے لیے مشکلیں بڑھاتا نہیں

یہ اور بات کہ جاں سے عزیز ہو جائیں
خوشی سے کوئی دکھوں کو گلے لگاتا نہیں

سب اپنا نفع خسارا بخوبی جانتے ہیں
میں جانے والوں کو واپس کبھی بلاتا نہیں

اڑان بھرنے کا دل عزم بھی نہیں رکھتا
کبھی کبھی مرے پہلو میں بھی سماتا نہیں

اکرم جاذب

یہ لازمی ہے محبت کے دیس آنے پر
کوئی بھی فیصلہ مت چھوڑنا زمانے پر

جو مجھ کو ڈھلتا ہوا دیکھ کر رہا خاموش
دہائی دینے لگا میرے ڈوب جانے پر

خیالِ تندیِ امواج ساتھ رہتا ہے
قریبِ ساحلِ دریا نگر بسانے پر

دکھائی دینے لگا ہے ہر اک ہدف آساں
کسی نے رکھ لیا جب سے مجھے نشانے پر

وہ انتخاب پہ نادم، میں ہاتھ آنے پر
جو وقت بیت گیا ہے پلٹ کے آتا نہیں

الگ الگ ہوئے خود ہی تمام کھوٹے کھرے
کبھی کسی کو بھی جاذب میں آزماتا نہیں

ہنسیں گے لوگ اب اس کی خراب حالی پر
جو ایک عمر سے مامور ہے ہنسانے پر

خیالِ تنگیِ داماں رلاتا ہے جاذب
کسی بھی دوست کی امید ٹوٹ جانے پر

غزل

یہ دنیا ہاتھ میں تھی ، تو نہیں تھا
تماشا گر پہ رنگِ ہُو نہیں تھا

ندی چڑھتے ہوئے دریا کے جیسی
سمندر سازشی مملو نہیں تھا

سلگتا دل پگھلنے لگ گیا تھا
صدائے درد کا بازو نہیں تھا

مہکتے لفظ گونگے ہو چلے تھے
شجر کی شاخ پہ آنسو نہیں تھا

تری تصویر پتلی پر دھری تھی
وہ منظر آنکھ کا جادو نہیں تھا

مقابل رات کی چارہ گری تھی
دعا کو خود پہ ہی قابو نہیں تھا

کنستر سب تماشوں سے بھرے تھے
چمکتا دن مگر ہر سو نہیں تھا

سنہرے سر پھٹی دستار اوڑھے
بلکتے دشت میں آہو نہیں تھا

سعدیہ بشیر

غزل

وہ بونوں میں کھڑا خود کو بہت اونچا سمجھتا ہے
وگرنہ اس کا جتنا قد ہے ہر بندہ سمجھتا ہے

یہی تو ہے ادھورا پن جسے سمجھا نہیں کوئی
کہ ہر بندہ ہی اپنے آپ کو پورا سمجھتا ہے

خدا قہار ہے، غفار ہے، محسن ہے، عادل بھی
خدا اس کے لئے ویسا ہے جو جیسا سمجھتا ہے

یہ اہلِ عقل سے کہہ دو کہ مجھ سے دور ہی ٹھہریں
جو دیوانہ ہو اس کی بات دیوانہ سمجھتا ہے

ہمارا میکدے سے دور رہنے کا سبب سمجھو
ہماری تشنگی ساقی نہ پیمانہ سمجھتا ہے

وفاداری صغیر اس کو وفاداری نہیں لگتی
تو پھر یہ طے ہوا مجھ کو وہ خود جیسا سمجھتا ہے

صغیر احمد صغیر

غزل

امر مہکی

بجھتی نہیں پیاس مگر دل بہلاتا ہوں
خالی گلاس ہی لے کر منہ سے لگاتا ہوں

ساحل کی ریت پہ میں نام نہیں لکھتا
بہتے پانی پر تصویر بناتا ہوں

شہر میں رہ کر بھی صحرائی طبیعت ہے
وحشت میں گلیوں کی خاک اُڑاتا ہوں

بیٹھے بیٹھے جانے کیا ہو جاتا ہے
ہنستا ہوں ، روتا ہوں ، کھو سا جاتا ہوں

چُپ چُپ رہنے کا کچھ خاص سبب ہے امر
کیا ہے کہ کسی کو احساس دلاتا ہوں

انتخاب

- خالد احمد -

نعمان منظور

بند دروازہ تھا خالد ، یا عبادت گاہ تھی
اس کے در پر سارے بے کس، سارے بے گھر سو گئے

غزل

کچھ مقرر نہیں ہے دھیان کی سمت
سر لُڑھکتا ہے پائے دان کی سمت

چھوڑتا ہوں زمین کو جب بھی
گرنے لگتا ہوں آسمان کی سمت

اک پرندہ ازل سے اڑتا ہے
لامکاں سے کسی مکان کی سمت

راہ دشوار ، منزلیں آسان
اشرَفی پھینک ، کوچوان کی سمت

خود بہ خود مڑ گیا اُڑن قالین
رات پیرس سے اصفہان کی سمت

شہر لٹتا ہے اب چڑھاویں کیا
نذر ، دلی کے خواجگان کی سمت

ایک ناؤ بنائی کاغذ کی
اُڑ گئے اس میں آسمان کی سمت

میری انگلی پکڑ کے چلتی ہے
زندگی قبر کے نشان کی سمت

عابد رضا

غزلیں

مجھے یہ نام کمانے میں بھی زمانے لگے
کہ دوست راہ کی دیوار بن کے آنے لگے

بچھڑنے والے نے سوچا نہیں بچھڑتے ہوئے
کہ اُس سے ملنے میں عمریں لگیں زمانے لگے

میں بولتا تو کئی لوگ پھر خفا ہوتے
میں چپ تھا اس لیے عزت پہ حرف آنے لگے

ضعیف باپ تھا سجدہ گزار مسجد میں
خدایا! شکر کے بچے مرے کمانے لگے

اسے بھی کام پڑا ہے سیاہ بختوں سے
یہ معجزہ ہے کہ ہم بھی نظر میں آنے لگے

ساجد رضا خان

برائے عشق، کسی کا وصال کھینچتا ہے
پھر اس کے بعد مسلسل وبال کھینچتا ہے

کسی کسی کو ہی ملتی ہے اس کے در سے نیاز
میاں یہ عشق کہاں سب کی کھال کھینچتا ہے

میں پہلے پہلے فنا کی حدوں کو چھوتا ہوں
پھر اس کے بعد ہی تیرا خیال کھینچتا ہے

لگا کے آس پڑے ہیں سبھی سمندر سے
یہاں ہر ایک مقدر کا جال کھینچتا ہے

ہمیں تو صبر بھی اجداد ہی سکھاتے ہیں
کسی پہ روئے تو آنسو مرے ٹھکانے لگے

کچھ اور کر بھی نہ سکتے تھے غم کی شدت سے
پھر ایک دن ترے بے کار مسکرانے لگے

کسی کو پھول نہیں دے سکا جو میں ساجد
تو میرے بچے محبت مجھے سکھانے لگے

وہ شخص وقت کا ہر ظلم سہن کرتا ہے
جو انتظار کی مدت میں سال کھینچتا ہے

یہ کس کی آنچ ہے جو کھینچتی ہے میرا سیو
مری نظر کو یہ کس کا جمال کھینچتا ہے

ہے کوئی آئنہ رو آنکھ میں مری ساجد
کچھ اس لیے مجھے عکسِ جمال کھینچتا ہے

غزل

ہوا کا رُخ بدلنے میں بھلا کب دیر لگتی ہے
گھروں کے گھر اُجڑنے میں بھلا کب دیر لگتی ہے

اُترنے دو اُفق کی سیڑھیاں سورج کو دھیرے سے
ستارے ٹمٹمانے میں بھلا کب دیر لگتی ہے

کوئی اپنے مکاں کی چھت پہ دانہ ڈال کر دیکھے
پرندوں کے اترنے میں بھلا کب دیر لگتی ہے

ہوا جب آندھیوں کی شکل میں آتی ہے باغوں میں
درختوں کے اکھڑنے میں بھلا کب دیر لگتی ہے

گلے شکوے مُسلسل دُوریوں کی وجہ بنتے ہیں
بھرم کے ٹوٹ جانے میں بھلا کب دیر لگتی ہے

بُلندی کی طرف پانی کا چڑھنا ہے ذرا مشکل
نشیبوں میں اُترنے میں بھلا کب دیر لگتی ہے

لڑائی ختم کرنے میں تو عمریں بیت جاتی ہیں
لڑائی کو بڑھانے میں بھلا کب دیر لگتی ہے

کوئی سیلِ رواں جب آ کے ٹکراتا ہے ساحل سے
تو مٹی کے پھسلنے میں بھلا کب دیر لگتی ہے

رقم کو جوڑنے کے واسطے ہیں مدتیں درکار
رقم کو صرف کرنے میں بھلا کب دیر لگتی ہے

کوئی صورت مری آنکھوں کو بھائے تو سہی فرحان
انا اپنی مٹانے میں بھلا کب دیر لگتی ہے

سرور فرحان

غزلیں

خواب دیکھوں گا نہ میں خواب دکھاؤں گا تجھے
ہاں مگر چھوڑ کے رستے میں نہ جاؤں گا تجھے

میں نے اس واسطے شعروں میں تجھے ڈھال دیا
سانس کی آخری لے پر بھی میں گاؤں گا تجھے

عین ممکن ہے کتابوں میں تُو پڑھتا ہوگا
اک غزل پاس بٹھا کر میں سناؤں گا تجھے

تو کسی روز مجھے دشت میں ملنے آنا
جام وحشت کے مرے یار پلاؤں گا تجھے

میں نے یہ سوچ کے لشکر سے بغاوت کی ہے
خود اگر ہار گیا تخت پہ لاؤں گا تجھے

دیکھ اجڑے ہوئے منظر تو مخاطب ہے مرا
تجھ سے وعدہ ہے کسی روز بساؤں گا تجھے

مجھ کو مسمار وہ کرتے ہوئے بولا ارشد
اب کسی اور طریقے سے بناؤں گا تجھے

ارشد محمود ارشد

جنگ لڑنے کی کوئی تدبیر دیتا میں تمہیں
خود نہتا رہ کے بھی شمشیر دیتا میں تمہیں

اپنے کاندھوں پر اٹھا کر قد بڑھایا ہے ترا
اس سے بڑھ کے اور کیا توقیر دیتا میں تمہیں

دوست بن کے وار تم نے جو کیا ہے پیٹھ پر
تجھ سا گر کم ظرف ہوتا چیر دیتا میں تمہیں

س کا رستہ دیکھتی ہے دل کی سونی رہ گزر
دوسرا کیسے کوئی رہگیر دیتا میں تمہیں

عشق کرتا تو سلیقے سے اگر بیٹے مرے
بعد اپنے قیس کی جاگیر دیتا میں تمہیں

کتنی حسرت تھی کہ ارشد تو مسیحائی کرے
کتنا چاہا تھا دلِ دلگیر دیتا میں تمہیں

غزل

اب بھی ہر موج کو ازبر ہے روانی تیری
رات دریا نے سنائی تھی کہانی تیری

پھر تو میں تھا، مرے آنسو تھے، تری یادیں تھیں
مل گئی تھی کوئی تصویر پرانی تیری

جب بھی ملتا ہے کوئی چاہنے والا تیرا
کوئی ہو ، مجھ کو وہ لگتا ہے نشانی تیری

میرے کمرے کے اندھیرے میں دیا ایک ہی تھا
جس کے شعلے میں فروزاں تھی جوانی تیری

گو ترے دن بھی کسی خواب کی تعبیر سے تھے
مجھ کو درکار تھی اک شام سہانی تیری

تو جو اک بار مجھے پھر سے میسر آئے
مان لوں میں جو کبھی بات نہ مانی تیری

میرے جذبوں پہ جمی برف پگھلنے لگ جائے
پھر میسر ہو اگر شعلہ بیانی تیری

دیکھ کر اپنی خطائیں میں یہی سوچتا ہوں
کچھ غلط بھی تو نہ تھی مجھ سے گرانی تیری

آ کسی رات مرے خواب میں آ، رات گئے
میں ترے شکوے سنوں پھر سے زبانی تیری

بے قراری کو مری آنے ہی لگتا ہے قرار
یاد آ جاتی ہے پھر نقل مکانی تیری

علمدار حسین

غزل

تعبیر کے دلاسے کا تاوان ہو گئے
آنکھوں میں جتنے خواب تھے ویران ہو گئے

دو چار دن کی بات جو ہوتی تو خیر تھی
اس عشق میں تو صدیوں کے نقصان ہو گئے

باقی تھی رات اور بجھایا گیا انہیں
کچھ دیر کو چراغ بھی حیران ہو گئے

جس وقت ایک شخص شجر کاٹنے لگا
اڑتے ہوئے پرندے تھے بے جان ہو گئے

پگڈنڈیوں کو پختہ سڑک کی نظر لگی
پختہ عمارتوں کے جب امکان ہو گئے

زر کی چمک مزار کی مٹی کو کھا گئی
درویش تخت والوں کے دربان ہو گئے

میں نے ملیحہ فاصلہ دنیا سے کر لیا
پھر یوں ہوا کہ فیصلے آسان ہو گئے

ملیحہ سیّد

غزل

جو عشق مطلب سے ماورا ہے وہ کس ادارے سے منسلک ہے
فقط پتنگے کے دل سے پھوٹے ہوئے شرارے سے منسلک ہے

کسی کے پاؤں کو چومتا ہے ابھی بھی دریا اچھل اچھل کر
جو پانی بھرنے کا سلسلہ تھا اُسی کنارے سے منسلک ہے؟

تم اپنا آنچل دبا کے دانتوں میں شوخ نظروں سے ہنس رہی ہو
جہان بھر کی تمام رونق اِسی نظارے سے منسلک ہے

عجیب لہجے میں ہیر مجھ کو گلے لگا کر یہ پوچھتی ہے
جو تخت رانجھے کے بخت کا تھا فقط ہزارے سے منسلک ہے؟؟

دعا ہتھیلی پہ ٹوٹ کر وہ فلک سے اترے گا دیکھ لینا
قبولیت کا یقین اب تک اسی ستارے سے منسلک ہے

خالد ندیم شانی

انتخاب

- خالد احمد -

نعمان منظور

کچھ تو سمجھاؤ ، کچھ تو بتاؤ
کوئی تو جیتا ، کوئی تو ہارا

غزل

جیون بنجر پیاسی سوچیں سوکھا پن اور میں
تیرے بن اب سونا سا ہے گھر آنگن اور میں

ڈھونڈ رہا ہوں تیری آہٹ سونے رستوں میں
بے ہنگم سی ساری سوچیں پاگل پن اور میں

کھنک رہی ہے قرب کی پائل یاد کے صحرا میں
تنہائی کی کالی راتیں دل دھڑکن اور میں

اب تک بوندیں برس رہی ہیں بیتے لمحوں کی
سونے رستے پیاسی نظریں اک ساون اور میں

چھوٹی سی اک بات پہ آنکھیں نم ہو جاتی تھیں
ہنسنے پر بھی چھلک پڑا ہے یہ برتن اور میں

دکھ تکلیفیں زیست کا شاید پہلا حصہ تھیں
لمبے رستے بھاری بستہ وہ بچپن اور میں

ہر اک جانب کچھ تصویریں گھومنے لگتی ہیں
پھٹا پھٹا دیوار و در کا یہ روغن اور میں

بیٹھے بیٹھے گھر کے باہر تکنے لگتا ہوں
ہر آہٹ پر دروازے کا یہ بندھن اور میں

پہروں تیری یاد میں جن سے دل بہلاتا ہوں
ساحل ریت سمندر سیپی نیل گگن اور میں

اب بھی بیتے لمحے میرے کان میں بجتے ہیں
پائل جھمکے چوڑی کنگن اک الجھن اور میں

سید محمد انجم معین بلے

غزل

چشم دی ، روشنی بھی دی اُس نے
آب بھی ، تشنگی بھی دی اُس نے

حسن کو بے رخی بھی دی اُس نے
عشق کو بے بسی بھی دی اُس نے

شاخ در شاخ ساتھ کانٹوں کا
پھول کو دل کشی بھی دی اُس نے

دل کو مائل کیا اُسی جانب
دل کو پھر بے کلی بھی دی اُس نے

درد دے کر تو لا دوا رکھا
ضبط میں آگہی بھی دی اُس نے

جب بھی سوچا حبیب اپنے لیے
اک نئی زندگی بھی دی اُس نے

بشیر احمد حبیب

غزل

روٹھنے والا گھر نہیں آیا
ہو گیا در بدر نہیں آیا

حُسن پورا نظر نہیں آیا
روپ تصویر پر نہیں آیا

سوکھتی رہ گئی مری مٹی
چاک پر کوزہ گر نہیں آیا

عید کیسے منائیں گے وہ لوگ
چاند جن کو نظر نہیں آیا

تیرے جاتے ہی یہ خیال آیا
تو اگر لوٹ کر نہیں آیا؟

شام سے تیرا منتظر تھا میں
تو مگر رات بھر نہیں آیا

چیختا رہ گیا سرِ صحرا
کوئی بندہ بشر نہیں آیا

تم خوشامد کی بات رہنے دو
عمر بھر یہ ہنر نہیں آیا

اپنے اجداد کی شرافت کا
تجھ پہ شاہد اثر نہیں آیا

شاہد فرید

غزل

دل کی محرومی کا کچھ یوں بھی مداوا نہ ہوا
اس نے آنکھیں نہ پڑھیں، ہم سے تقاضا نہ ہوا

اپنے سر لے لیے الزام سبھی الفت کے
بے وفائی کا تری ہم سے تماشا نہ ہوا

انگلیاں اٹھیں گی پھر کس کی مسیحائی پر
میں ترے ہاتھ میں آ کر بھی جو اچھا نہ ہوا

بھول کر ایک بھی وعدہ نہ وفا تو نے کیا
صبر کا پھل بھی ترے عہد میں میٹھا نہ ہوا

حال پوچھا نہ مصیبت میں کسی نے میرا
ڈوبتے کو یہاں تنکے کا سہارا نہ ہوا

تو وہ مختار، ترے جی میں جو آئے سو کرے
میں بہر طور وہ عاجز کہ جو چاہا نہ ہوا

نوید عاجز

غزل

نسلیں پلٹ رہی ہیں حالات کا بھلا ہو
اے شہرِ یار تجھ میں خطرات کا بھلا ہو

حلقہ زنِ عزا ہوں کیسے کہوں میں ظالم
جاگیردار تیری بارات کا بھلا ہو

کرتی رہی جو مدعو آنکھوں میں نیند، راحت
روئے بغیر گزری اُس رات کا بھلا ہو

جن کے سروں سے واری خیرات کھا رہا ہوں
اس خیر کے مخیّر سادات کا بھلا ہو

کچھ دن اچھوت بھی ہے اس کے لیے مبارک
شودر سے بھی کہے گا کم ذات کا بھلا ہو

جوڑے ہوئی ہیں ہم کو اک دوسرے سے اب تک
پل پل میں ہونے والی حاجات کا بھلا ہو

ساگر ہمارے حق میں بھاری دلیل تھی وہ
جو کاٹ دی گئی ہے اُس بات کا بھلا ہو

ساگر حضور پوری

غزلیں

غموں کا گھونسلہ میرا ٹھکانہ ہے
پڑوسی بھی سپیروں کا گھرانہ ہے

کوئی اپنا نہیں تیرے سوا یا رب
تماشائی یہاں سارا زمانہ ہے

پرندوں کی طرح ہجرت کروں گا میں
نکل کر شہر سے مقتل سجانا ہے

سکونت چھوڑ کر شہرِ ستم گر کی
ستاروں پر جہانِ نو بسانا ہے

بصیرت عام کرنی ہے خرابوں میں
سکندر دشمنوں کو بھی پڑھانا ہے

مرزا سکندر بیگ

جل گیا شہرِ دل تمہارا بھی
لٹ گیا قافلہ ہمارا بھی

سامنے بے کراں سمندر ہے
چل دیئے چھوڑ کر کنارا بھی

راستے تر بتر ملے خوں سے
جسم کو آگ سے گزارا بھی

ہم سفر رات کے مسافر ہیں
کھو گیا شام کا ستارا بھی

دیکھ کر سامنے درندوں کو
زندگی زندگی پکارا بھی

ہم سکندر گزر گئے جاں سے
راہ میں خاندان ہارا بھی

غزل

بہت دنوں کی اُداسی کے بعد ٹوٹا ہے
حصارِ جسم خموشی کے بعد ٹوٹا ہے

یوں لگ رہا تھا پرندے فضا میں رک گئے ہیں
یہ سب طلسم تو سیٹی کے بعد ٹوٹا ہے

کسی نے دیکھا نہیں کیسے ڈٹ گیا، تنہا
وہی درخت جو آندھی کے بعد ٹوٹا ہے

انا کے بُت کو کہاں کوئی توڑ سکتا ہے
مگر وہ دل کی صفائی کے بعد ٹوٹا ہے

کوئی پھلانگ کے دیوار گھر میں آیا ہے
یہ تالا لگتا ہے گُنڈی کے بعد ٹوٹا ہے

سخن سراؤں نے جتنا مچایا تھا پہلے
وہ شور میر کی دلّی کے بعد ٹوٹا ہے

بدلتے موسموں کے اپنے ذائقے ہیں ظہور
یہ آم پیڑ سے گرمی کے بعد ٹوٹا ہے

ظہور چوہان

غزل

ساتھ بیٹھا ہے چور کتنا ہے
اس پہ آنکھوں میں زور کتنا ہے

یہ جو منصوبے تم بنا رہے ہو
وقت رہتا ہی اور کتنا ہے

ایک گھنٹے سے چپ ہی بیٹھے ہیں
تو بھی اے یار بور کتنا ہے

جانتا ہوں یہ میں کہ تیرا بھی
میری باتوں پہ غور کتنا ہے

ایک خاموشی سی دماغ میں ہے
پر مرے دل میں شور کتنا ہے

چند سانسوں کی ڈور کھینچنی ہے
چند سانسوں کا دور کتنا ہے

کیفی قلندر

انتخاب

- خالد احمد -

نعمان منظور

محفلِ ماہتاب میں نجمِ سحر نہیں تو کیا
لاکھ نیازمند ہیں ، ایک اگر نہیں تو کیا

غزل

زر و گوہر ملے تو دل بھی پیارے بیچ سکتے ہیں
ہم ایسے لوگ ہیں اپنے دلارے بیچ سکتے ہیں

ہمیں ہے کیا غرض دنیا بھلے تاریک ہو جائے
ہمارا بس چلے تو چاند تارے بیچ سکتے ہیں

ہمیشہ فائدہ اپنا مقدم جانتے ہیں ہم
منافع بخش ہوں پھر بھی ادارے بیچ سکتے ہیں

کتابِ زیست میں اپنی نہیں بابِ وفا شامل
سوا اپنی چاہتوں کے سب شمارے بیچ سکتے ہیں

ضرورت روشنی کی جب نہیں اندھوں کی بستی میں
یہ آنکھیں بیچ سکتے ہیں، نظارے بیچ سکتے ہیں

کہیں ہم راستوں کی دھول بن کر ہی نہ رہ جائیں
ہمیں ڈر ہے، ہمیں رہبر ہمارے بیچ سکتے ہیں

ہمارے خواب ہیں جبران دشمن کی نگاہوں میں
یہ ظالم تو ہمارے سب سہارے بیچ سکتے ہیں

وسیم جبران

غزلیں

یہ اونچ نیچ اور نہ مری ذات دیکھئے
آنکھوں میں میری پیار کے جذبات دیکھئے

کرنا ہے میرے ساتھ اگر پیار کا سفر
پھر دن کا سوچیے نہ کبھی رات دیکھئے

کچھ اس طرف بھی کیجئے اپنی نگاہِ خاص
فرصت ملے تو شہر کے حالات دیکھئے

چھاتی ہے کیسے تیرگی وقتِ غروبِ مہر
ڈستی ہے کیسے دن کو یہ ظلمات دیکھئے

کچھ اپنے خستہ حال گھروندے کا سوچئے
اب شوق سے نہ اتنی بھی برسات دیکھئے

کوئی بھی حل نہیں ہے مقدر کے لکھے کا
افضل نہ اتنا غور سے اب ہات دیکھئے

افضل ہزاروی

یہ کیسی ہے فغاں تیری
لگے خنجر زباں تیری

مرا سچ ہے خسارے میں
چلے جھوٹی دُکاں تیری

سراسر پھول کھل جائیں
نظر جائے جہاں تیری

جہاں چلتی ہو ظالم کی
چلے کیسے وہاں تیری

نہ ظالم نے سکوں بخشا
نہ راس آئی اماں تیری

یہ دنیا فانی ہے افضل
یہ منزل ہے کہاں تیری

غزل

زیست کا اعتبار ختم ہوا
مرنا یہ بار بار ختم ہوا

تھا عبث جاننا اِسے دائم
کچھ نہ تھا پائیدار ختم ہوا

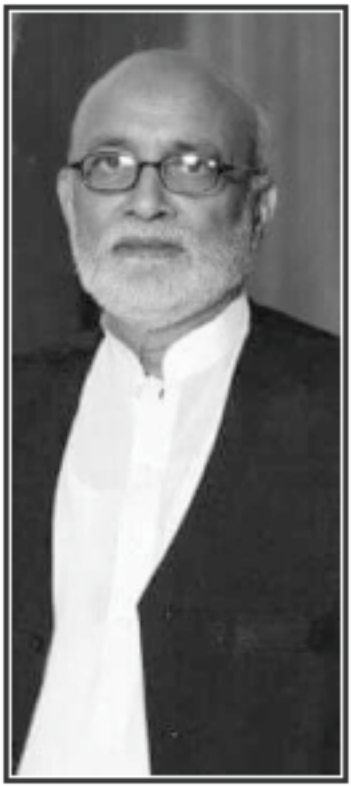

صاف آنے لگی نظر ہر شے
چاروں جانب غبار ختم ہوا

اور جینا ہے کتنے روز ہمیں
روز کرنا شمار ختم ہوا

زندگی اور ہو گئی ارزاں
موت کا انتظار ختم ہوا

روز لگنا حیات کی قیمت
یہ بھی اب کاروبار ختم ہوا

اب چمن ہے خزاؤں کی زد پہ
عہدِ فصلِ بہار ختم ہوا

موت گویا سروں پہ آ پہنچی
زیست پر انحصار ختم ہوا

عجز سب رہ گئے دھرے انجم
اپنا سب انکسار ختم ہوا

محمد افضال انجم

غزل

لُٹا پٹا ہے تمنّا کی یاوری کا دور
کہاں تلاش کریں باہمی خوشی کا دور

سنا ہے جب سے مشینیں کلام کرتی ہیں
غضب کا اترا ہے بستی میں خامشی کا دور

سپردِ زنداں کیے جا رہے ہیں اہلِ حق
دوام پائے گا کس طور آشتی کا دور

فنا کی رہ پہ رواں ہیں یہ جانتے ہوئے بھی
قبول سب نے کیا ہے یہ دھاندلی کا دور

پرانے بکسے میں برسوں دبی رہی ہے جو
اس ایک یاد سے مہکا ہے زندگی کا دور

دِیے بجھانے پہ مامور جب محافظ ہوں
ہَوا کو حق ہے کرے خاک آمری کا دور

فرات اب بھی ہے افسوس کے بنا جاری
رواں ہے ماتمی چہروں پہ تشنگی کا دور

صداقتیں بھی یہاں جھوم جھوم جاتی ہیں
چلا ہے بزم میں کیسا یہ مے کشی کا دور

ردا حاصل خلوص

انتخاب
- خالد احمد -
نعمان منظور

دیکھا نہ ہمیں تُو نے خط و خال سے آگے
اک شہر تھا ، اِس شہرِ مہ و سال سے آگے

غزل

شریانیں اپنے دل کی میں سب ہی سکیڑ کے
بیٹھی ہوں تیری یاد کے بخیے ادھیڑ کے

چھو کر تجھے ٹھکتی ہوئی آئے گی ابھی
جائے گی پھر نگوڑی ہوا مجھ کو چھیڑ کے

آنگن میں دل کے تو نے لگایا تھا جو کبھی
احساں بہت ہیں مجھ پہ اُسی ایک پیڑ کے

کن راستوں سے آیا ہے اب کیا کہوں میں ہجر
دروازے کھڑکیاں تھیں رکھی میں نے بھیڑ کے

ڈھونڈوں بھی کیوں بھلا تجھے دنیا کی بھیڑ میں
کرنا بھی کیا ہے ہجر کا جھگڑا نبیڑ کے

الماس شبی

انتخاب

- خالد احمد -

نعمان منظور

ہم اپنے دل پہ کچھ نازاں تھے خالد
سو اک دن ہم کو ہونا تھا خجل بھی

غزل

اورنگزیب حسام حر

ہر ایک وقت کسی خلفشار میں گم سا
میں اپنے آپ سے آمادۂ تصادم سا

ہر ایک شہر میں شاعر مزاج بستے ہیں
ہر ایک شعر میں ہے کوئی ہو بہو تم سا

ہمارے ہاتھ ہے سرشار جھومتا ساقی
اٹھائے دوش پہ آب حیات کا خم سا

مجھے ہے علم کہ اس لفظ کے ہیں معنی کیا
مری طرح سے مگر لفظ بھی ہے گم صُم سا

سفید نرم سی ململ لباس تھا اپنا
کسی نے بھول کے اوڑھا دیا ہے قاقم سا

یہ اور بات اندھیروں کے درمیاں روشن
ہمارے دل پہ نشاں نقش ماہ و انجم سا

ہر ایک شخص کا دل چاہتا ہے چین، سکوں
ہر ایک شخص میں برپا ہے اک تلاطم سا

غزل

جیا قریشی

وہ جو کہتا تھا ''نازنیں میری''
اب خبر ہی اسے نہیں میری

سارا سسرال میرا دشمن ہے
سانپ تیرے ہیں، آستیں میری

کوئی حق ہی نہیں مرا اس پر
یہ جو دنیا ہے بالیقیں میری

سجدۂ مرگ ہی نہ بن جائے
سنگِ در پر رکھی جبیں میری

جھلملاتا ہے کوئی عکس جیا
بجھتی آنکھیں بھی ہیں حسیں میری

انتخاب

- خالد احمد -

نعمان منظور

یہ بھید کھلا معرفتِ شام و سحر سے
دن، شب سے جدا ہے نہ الگ عیب، ہنر سے

غزل

رخسانہ سمن

تمہاری ذات سے بندھن نہیں ہے
کسی بھی کام کا جیون نہیں ہے

زمینِ خواب کو ، کوئی بتائے
مری آنکھوں میں اب ساون نہیں ہے

گھروندے بن چکے ہیں اب یہاں پر
فقط بیکار سا آنگن نہیں ہے

تعجب ہے کہ تیرے آئنے کو
ہمارے نام سے اُلجھن نہیں ہے

یہاں پر آتے جاتے ہیں سمندر
جو سوکھا ہے ، مرا دامن نہیں ہے

ٹپکتی چھت کی سب بوندیں سمیٹے
ہمارے گھر میں وہ برتن نہیں ہے

انتخاب

- خالد احمد -

نعمان منظور

سرِ حیات اک الزام دھر گئے ہم بھی
کلام بھی جیا اور مر گئے ہم بھی

غزل

جفا کا سلسلہ تو تھا مگر دراز نہ تھا
کھلی تھی ان سے ہر اک بات، کوئی راز نہ تھا

جہاں سے ہم چلے جائیں، اُسے خبر ہی نہ ہو
وہ بے نیاز تو تھا، اتنا بے نیاز نہ تھا

اسی لیے نہ ملی میرے شعر کو شہرت
میں جس پہ نغمۂ غم گا سکوں وہ ساز نہ تھا

یہ اور بات کہ مَیں رویا عمر بھر اُس پر
وہ سانحہ مگر اتنا بھی دل گداز نہ تھا

نکل تو جاتا میں تسخیرِ شہرِ جاناں کو
وفا شعار تھا محمود اور ایاز نہ تھا

نعمان محمود

انتخاب

خالد احمد

نعمان منظور

دنیا فقط گماں ہے، سب کچھ درونِ جاں ہے
جاگو ضرور خالد ، آنکھیں مگر نہ کھولو

غزل

کوچۂ عشق تری راہ گزر ہے ہی نہیں
اس سفر میں تو کوئی رختِ سفر ہے ہی نہیں

دھوپ ہی دھوپ ہے اس خانۂ ویرانی میں
دشت میں غم کے مرے کوئی شجر ہے ہی نہیں

کس طرح عزمِ سفر میں بھی ترے ساتھ کروں
جب کہ درپیش محبت کا سفر ہے ہی نہیں

میں نے چاہا تھا کسے اور کسے پایا ہے
دیکھتا ہوں میں جدھر وہ تو اُدھر ہے ہی نہیں

عشق ہوتا تو کوئی بات بنا بھی لیتے
ہاتھ میں اپنے کوئی زخمِ ہنر ہے ہی نہیں

شام کو ساتھ لیے پھرتے رہے عمر تمام
رات وہ پائی ہے کہ جس کی سحر ہے ہی نہیں

دیکھ تو لیتا ہے وہ مجھ کو عنایت سرِ بزم
گرچہ مائل بہ کرم رشکِ قمر ہے ہی نہیں

عنایت اللہ عنایت

غزل

مَیں کہاں اس زلف کی زنجیر سے باہر گیا
وہ پری چہرہ مری تقدیر سے باہر گیا

ہاں کوئی انجان سی دستک سنی تھی مَیں نے بھی
ہائے رے قسمت کہ مَیں تا خیر سے باہر گیا

اس پری پیکر کے آگے میری کیا اوقات تھی
مَیں تو بس اک خواب تھا تعبیر سے باہر گیا

قریہ قریہ، کوچہ کوچہ پھول کھلنے لگ گئے
مَیں جو اک دن خیمۂ شمشیر سے باہر گیا

کب تلک رہتا کوئی غنچہ دہن کی قید میں
رنگ تھا ایسا کہ جو تصویر سے باہر گیا

مَیں نے زاہد کیا لکھی ہے سوز میں ڈوبی غزل
رنجِ دل آخر کو اس تحریر سے باہر گیا

زاہد محمود زاہد

غزل

اس لئے میرے بہک جانے کا امکان نہیں
میری دُنیا میں کہیں صبر کا بحران نہیں

ڈھونڈ مستانہ و دیوانہ کوئی مجھ جیسا
ہجر میں گھُلتی جوانی سے پریشان نہیں

راستے عالمِ لاہوت کے ہیں یاد مجھے
ہے ترا دستِ سخاوت کہ میں انجان نہیں

ریت کے ذرے کھٹکتے ہیں مری سانسوں میں
کیا کہا دشت کا موسم مرے شایان نہیں؟

ہر طرف اہلِ ہوس ، اہلِ ستم قابض ہیں
ان دنوں اہلِ جُنوں کا کوئی پرسان نہیں

جو مری سوچ ، مری فکر مقیّد کر دے
ایسا فی الحال جہاں میں کوئی زندان نہیں

اس بھری دُنیا میں یہ بھید جُدا عشق کا ہے
جامی اس راہ میں لُٹ جائیں تو نقصان نہیں

مستحسن جامی

غزل

کون کہتا ہے زمانے کے لیے جیتے ہیں
ہم ترے ناز اٹھانے کے لیے جیتے ہیں

دور منزل ہے مگر وقت کے صحراؤں میں
ہم ترا ساتھ نبھانے کے لیے جیتے ہیں

ان کو ملتی ہے ترے ہجر کی دولت یارا
جو ترا وصل کمانے کے لیے جیتے ہیں

زندگی ایک سفر ہے جو کٹھن ہے لوگو!
بس یہی بات بتانے کے لیے جیتے ہیں

ہم نے دیکھے ہیں کئی درد کے مارے انساں
جو فقط اشک بہانے کے لیے جیتے ہیں

نام آئے گا ہمارا بھی انہی میں عرفاں
لوگ جو پھول کھلانے کے لیے جیتے ہیں

محمد عرفان خان

انتخاب

- خالد احمد -

نعمان منظور

نقش تھا مَیں بھی کِسی تختی کا
اڑ گئی خاک معانی میری

غزل

چاندنی اشک بار ہے جاناں
دل بہت بے قرار ہے جاناں

کیا ستارے فلک سے اترے ہیں
کیا گُلوں پر نکھار ہے جاناں

ایک ماحول ہے محبت کا!!
ایک رنگِ بہار ہے جاناں

پوچھنے پر بتا نہیں سکتے
آنکھ میں کیوں خمار ہے جاناں

کیا خبر کب فریب دے جائے
دل پہ کب اختیار ہے جاناں

آرزو خوشبوؤں میں رہی ہے
زندگی پھر بہار ہے جاناں

آنکھ بھی تم پہ صدقے ہوتی ہے
دل بھی تم پہ نثار ہے جاناں

تم ملو تو کبھی مکمل ہو
خواب جو تار تار ہے جاناں

تم سے مل کر سلیم کہتا ہے
تو ہی دل کا قرار ہے جاناں

سلیم اختر

غزل

درونِ خانہ عدم تناؤ نظر تو آئے
ہمارا آپس میں رکھ رکھاؤ نظر تو آئے

ابھی سے تھک ہار کے گھروں میں دبک گئے ہو
بدن پہ شدت کا ایک گھاؤ نظر تو آئے

یہ کیا کہ سردار بن کے مسند پہ بیٹھ جاؤ
کسی کی رائے، کوئی چناؤ نظر تو آئے

یہ سب توانا بدن زمیں بوس ہو رہے ہیں
کسی طرف سے کوئی کٹاؤ نظر تو آئے

نظر تو آئے کثیف شے کا لطیف پہلو
یہ تیز روشن دیے بجھاؤ نظر تو آئے

غبار دل کا نکال پھینکو، سکون پاؤ
کسی کے حق میں ذرا جھکاؤ نظر تو آئے

میں کس بھروسے پہ ہاتھ اوپر کروں، پکاروں
کہیں پہ ساحل، کنارا، ناؤ نظر تو آئے

شاہد شوق

غزل

کومل جوئیہ

سبز موسم کو بھی تحریرِ خزاں بولتے ہیں
آج کل پیڑ اداسی کی زباں بولتے ہیں

بعض اوقات مکینوں کی خموشی سے ڈری
کھڑکیاں شور مچاتی ہیں، مکاں بولتے ہیں

کون کرتا ہے ترے بعد ترے جیسا سخن
ہم ترے بعد کسی سے بھی کہاں بولتے ہیں

اونچی آواز میں عادت تو نہیں بولنے کی
ضبط جب توڑ دیا جائے تو ہاں، بولتے ہیں

جس جگہ مان رکھا جائے خطابت کا اے دوست
ہم انا زاد بہت کھل کے وہاں بولتے ہیں

کیا غلط کرتے ہیں ہم فرطِ عقیدت سے کبھی
تیری آنکھوں کو اگر سارا جہاں بولتے ہیں

اس قدر جھوٹ، ملاوٹ ہے مری بستی میں
دھول ملبے کی اڑی ہو تو دھواں بولتے ہیں

کسی اللہ نہیں کہتا کوئی مدت سے
اب بھی ٹھوکر ہمیں لگتی ہے تو ''ماں'' بولتے ہیں

غزل

بات کرنے کا سلیقہ نہیں آیا مجھ کو
جب سے اس آنکھ نے جی بھر کے ہے دیکھا مجھ کو

ایک دنیا نئی آباد ہوئی تھی مجھ میں
کھینچ کر جیسے ہی سینے سے لگایا مجھ کو

حسن اور کی عشق کی اس جنگ میں تاخیر کے ساتھ
دشت ریزی میں تبسم سے ہے چاہا مجھ کو

حیرت افروز ہوئے شہرِ طلسمات کے لوگ
اس نے جس وقت بڑے پیار سے مانگا مجھ کو

اس لیے روکتا ہوں میں تجھے جانے سے کہیں
دوست اچھا نہیں لگتا ترا چرچا مجھ کو

کتنا حیران ہوا دیکھ کے تصویر کو میں
وادیِ نیند میں جب خواب نہ آیا مجھ کو

ایک دن چھو لیا الماری میں دیوان پڑا
اور اس دن سے سکوں ڈھونڈ نہ پایا مجھ کو

میں نے بھی خود ہی اسے جان یہ سونپی تھی ندیم
اس نے بھی تیر بڑے پیار سے مارا مجھ کو

ندیم ملک

غزل

چل پڑی ہے ہوا اداسی کی
بن رہی ہے فضا اداسی کی

تیرے چہرے سے ہی چرائی ہے
موسموں نے ادا اداسی کی

دیکھ دستِ شفق پہ قدرت نے
پھر سجا دی حنا اداسی کی

پھیلتی جا رہی ہے تیزی سے
شہر میں پھر وبا اداسی کی

منتخب کی تھی خود ہی اپنے لیے
مل رہی ہے سزا اداسی کی

اب میں ہر پل اداس رہتا ہوں
کس نے دی ہے دعا اداسی کی

تیری یادوں کے سرد موسم میں
اوڑھ لی ہے ردا اداسی کی

مجھ کو اچھی نہیں لگی قیصر
تیرے رخ پر ادا اداسی کی

قیصر مسعود

غزلیں

مجھے یقیں جو مقدر کی بات پر آیا
تو میں بھی زینۂ امکان سے اتر آیا

مرے شعور سے جو کچھ نہ آنکھ دیکھ سکی
زمیں کی آنکھ کھلی تو وہ سب نظر آیا

مجھے خدا نے کہا جاؤ دیکھ آؤ زمیں
میں آسمان سے ایسے نہیں اتر آیا

تو یہ سمجھتا ہے آسان تھا سفر میرا
تری طرف میں زمانوں کو روند کر آیا

یہ بیڑیاں مرے اجداد کی نشانی ہیں
یہ طوق ایسے گلے میں نہیں اتر آیا

کہ تم سے پہلے زمانے کی گرد تھی مجھ پر
تمہارے ہاتھ میں آیا تو میں نکھر آیا

مجھے گلوں نے مہک دی نہ رس دیا اپنا
سو تتلیوں کو سبھی باغ دان کر آیا

انتظار سیّد

بار شکستگی میں بھی دم کھینچتا ہوا
تجھ تک پہنچ گیا میں قدم کھینچتا ہوا

ڈر ہے کہ ڈوب جاؤں نہ موجِ گریز میں
میں بھی کسی کی آنکھ سے نم کھینچتا ہوا

وہ چشمۂ وجود میں کھلتا ہوا کنول
میں سانس سانس فکرِ عدم کھینچتا ہوا

وہ آخری درخت بھی افسوس گر پڑا
اک عمر سے زمین کے غم کھینچتا ہوا

میں گر پڑا تھا وقت کے ہاتھوں سے انتظار
اپنی حدودِ ذات سے غم کھینچتا ہوا

غزل

اس کا غم آس پاس ہے پھر بھی
دل کی بستی اُداس ہے پھر بھی

فصلِ گل آ گئی ہے گلشن میں
ہر شجر بے لباس ہے پھر بھی

حادثوں نے جسے اجاڑ دیا
اس کو جینے کی آس ہے پھر بھی

اس نے دریا پہ لا کے چھوڑ دیا
میرے ہونٹوں پہ پیاس ہے پھر بھی

جس کو دیکھا نہیں زمانے سے
وہ مرا غم شناس ہے پھر بھی

بارشیں کب کی تھم چکیں سرشار
وہی خوف و ہراس ہے پھر بھی

اکرام الحق سرشار

غزلیں

بقا کی جستجو دارِ فنا کے ہوتے ہوئے
بھرا بھرا سا جہاں ہے خلا کے ہوتے ہوئے

مجھے تو کافی مرا صبر ہے، ستم کیا ہے
کوئی بھی رنج نہیں ہے دعا کے ہوتے ہوئے

میں کون مشورہ ایسے میں اب تمھیں دیتا
ملا ٹھکانہ نہ ارض و سما کے ہوتے ہوئے

مرے مرض کی بھی تشخیص کر طبیب مرے
گھٹن ہے سینے میں تازہ ہوا کے ہوتے ہوئے

سبھی کو اپنے کیے کا ملے گا، واقعی میں
سزا ملی ہمیں اہلِ جزا کے ہوتے ہوئے

کرو نہ فکر محبت کی فکر کافی ہے
کرو نہ فکر دلِ مبتلا کے ہوتے ہوئے

قمر نیاز کہیں بھی تو کس طرح کہیں ہم
کوئی نہیں ہے ہمارا خدا کے ہوتے ہوئے

قمر نیاز

صحرا کی ہواؤں سے ہے تقدیر تمھاری
اک خاکِ کفِ پا بنی اکسیر تمھاری

کاغذ کی طرح کوئی نہ سونے کا ورق ہے
ہم کو تو سند جیسی ہے تحریر تمھاری

ملتی دلِ بے تاب کو راحت ہے زیادہ
آئے جو کبھی یاد بھی رہگیر تمھاری

بٹوے میں نہیں عکس تمھارا مرے چندا
مصرعوں میں لیے پھرتے ہیں تصویر تمھاری

اے دوست ملاقات کرو لازمی مجھ سے
اے دوست اداسی ہے بغل گیر تمھاری

صحبت نہیں مطلوب قمر غیر کی مجھ کو
صحبت مجھے مطلوب ہے بس میر تمھاری

غزل

بھٹکنے والے کو آخر کہیں پہ گرنا تھا
تمہارے در پہ گرا ہوں یہیں پہ گرنا تھا

ہوا کے دوش پہ کب تک فضا میں رہتے ہم
کماں سے نکلے ہوؤں کو زمیں پہ گرنا تھا

تمہاری آنکھ کی وحشت سے لگ رہا تھا ہمیں
تمہارا اشک ہماری جبیں پہ گرنا تھا

اب اس کی لاش کو ملبے سے ڈھونڈتے کیا ہو
مکاں کے بوجھ کو اک دن مکیں پہ گرنا تھا

نبھانا تھا مجھے کردار اک توازن سے
جہاں سنبھلنا تھا مجھ کو وہیں پہ گرنا تھا

چراغ جلتا ہے جل جل کے بجھ ہی جاتا ہے
تمہاری ہاں کو کسی دن نہیں پہ گرنا تھا

محمد حسنین پرویز

غزل

جفاؤں کی دہائی میں محبت ہار جاتی ہے
کہ انساں کی خدائی میں محبت ہار جاتی ہے

کہیں دستار سے پھندا لگا کر مر گیا کوئی
بزرگوں کی لڑائی میں محبت ہار جاتی ہے

سنو دولت کی کثرت پر کبھی بھی مان مت کرنا
کہ اکثر خود ستائی میں محبت ہار جاتی ہے

وفاؤں کا بھرم مضبوط کرتا ہے تعلق کو
وفاؤں سے رہائی میں محبت ہار جاتی ہے

تمھیں اپنی انا پیاری، ہمیں دکھ ہے جدائی کا
سنا ہے اس جدائی میں محبت ہار جاتی ہے

مرتب گوشوارے دل کے سچائی سے تم کرنا
سیاسی کارروائی میں محبت ہار جاتی ہے

عبدالرؤف زین

انتخاب

- خالد احمد -

نعمان منظور

کون تمھیں سمجھائے خالد
کون اُٹھائے بوجھ تمھارا

مسلسل غزلیں (دوسرا پڑاؤ)

نجومی نے جسے اچھا کہا تھا
خدا جانے وہ کس کا زائچہ تھا

کہاں یہ خوش مزاجی اور کہاں مَیں
بس اتنا ہے کہ چپ بیٹھا ہُوا تھا

مجھے اَرزاں ہوئی تھی زندگانی
مَیں پتھر میں خدا کو دیکھتا تھا

کسی کو مجھ سے ہمدردی نہیں تھی
مگر یہ بات مَیں بھی جانتا تھا

کوئی پیکر، نوید اُس وقت بھایا
مَیں اپنے آپ سے بھی جب خفا تھا

یونہی ، بس ایک دھوکا سا ہُوا تھا
مرے ہمراہ کوئی کب چلا تھا!

بس اِک دم ریل کی سیٹی بجی تھی
اور اس کے بعد میں تنہا کھڑا تھا

مجھے بھی راستے میں چھوڑ آئے
وہ سب، جن کا میں تنہا آسرا تھا

زمیں سے آسماں تک دائروں پر
صدا نا آشنا پردہ پڑا تھا

نوید! اب یاد آیا، مَیں نہیں تھا
کوئی مجھ سا ، مرے آگے کھڑا تھا

حصولِ علم کا لپکا لگا تھا
مَیں پہلی بار گھر سے جا رہا تھا

بظاہر خوش بباطن مضطرب تھے
مَیں گھر میں سب کی آنکھیں پڑھ رہا تھا

اچانک ریل کی سیٹی بجی تھی
کسی کا ہاتھ ہِلتا رہ گیا تھا

بڑی آسانیوں میں دن گزارے
بمشکل خود سے بچ کر چل رہا تھا

محبت پہلے زینے پر کھڑی تھی
فسانہ برسوں آگے جا چکا تھا

کسی نے دفعتاً مجھ کو پکارا
مَیں کچھ سوچے بِنا ہی رک گیا تھا

کسی مٹی کی ڈھیری پر کھڑا مَیں
خدا معلوم، کیا کیا سوچتا تھا

الاؤ کے بھڑک اُٹھنے پہ دیکھا
مرے چاروں طرف بس مَیں کھڑا تھا

مِٹی جاتی تھیں ہاتھوں کی لکیریں
مگر مَیں تھا کہ سپنے دیکھتا تھا

مگر یہ کیا تھا، کیوں تھا، کس لیے تھا
مَیں پہروں یوں ہی بیٹھا سوچتا تھا

نوید اِک روز، پھر اہلِ فلک نے
زمیں کے باسیوں کو روندنا تھا

سرائے کا دیا بجھنے لگا تھا
دریچوں سے اندھیرا پل پڑا تھا

کوئی اَن جان لمحوں کا تماشا
مسافر وسوسوں میں گھر رہا تھا

گھنا جنگل ،اندھیری شب ، سرائے
مظاہر میں عجب ایکا ہوا تھا

رگوں میں تیرتی ویرانیوں نے
کڑی رُت کا سندیسہ دے دیا تھا

اِدھر یہ حال تھا اور اُس طرف مَیں
مسلسل اپنا رستہ دیکھتا تھا

وہی باتیں، وہی جھگڑے، وہی مَیں
نوید اب کیا بتاؤں، کیا ہُوا تھا

مجھے کس خوف نے گھیرا ہُوا تھا
کوئی اِن سیڑھیوں پر چل رہا تھا

کوئی قدموں کی آہٹ تھی کہ دل میں
کسی انہونی کا دھڑکا لگا تھا

میں یوں ہی تو نہیں گھبرا رہا تھا
مرے کمرے کا دروازہ ہِلا تھا

اور اُس پر چھت سے لٹکا برقی پنکھا
تسلسل سے جھکولے لے رہا تھا

بہت دن پیش تر بھی یوں ہُوا تھا
کوئی سایہ یہاں تک آ گیا تھا

مری آواز گویا دب گئی تھی
مرے چاروں طرف اک واہمہ تھا

سو ایسے میں، نوید! اِک کم سخن کو
اب اِس سے بڑھ کے کتنا بولنا تھا

نوید صادق

آستین کا انسان

ڈجو سانپ کو اس کمپنی میں ملازمت مل گئی تھی۔ کمپنی کا مالک پخو سانپ تھا۔ پخو سانپ نے بے حد چھان پھٹک کر ڈجو سانپ کو اس پوسٹ پر ملازمت دی تھی۔ تمام اُمیدواروں کے انٹرویو پخو سانپ نے خود لیے تھے، ڈجو سانپ سے انٹرویو لیتے ہوئے پخو سانپ کو بخوبی پتہ چل گیا تھا کہ ڈجو سانپ کو کمپنی میں ملازمت دے کر وہ عقل مندی کا کام کر رہا ہے۔ اسے اپنی کمپنی کو ترقی دلانے کے لیے کسی ایسے کارکن کی ضرورت تھی جو دور اندیش ہو اور اپنی ذمہ داری بخوبی ادا کرتا ہو، ڈجو سانپ میں یہ خوبیاں موجود تھیں، اسی لیے یہ ملازمت اس کو دے دی گئی تھی۔

ڈجو سانپ دن رات کام کرتا تھا۔ ڈجو سانپ تن تنہا کئی کارکنوں کے برابر کام کر لیتا تھا۔ پخو سانپ اس کے کام سے مطمئن اور خوش تھا۔ کمپنی تیزی سے ترقی کرنے لگی اور کمپنی کا چرچا ہر طرف ہونے لگا۔ یہ ڈجو سانپ کے دن رات کام کرنے کے سبب ممکن ہوا۔ پخو سانپ نے خوش ہو کر ڈجو سانپ کی تنخواہ بڑھا دی۔ ڈجو سانپ خوشحال ہو گیا، اس کے پاس کئی آسائشیں آ گئیں۔ اسے بونس بھی دیا جاتا تھا۔ وہ کمپنی کا خاص کارکن بن گیا تھا۔

پھر وقت نے پلٹا کھایا اور کمپنی کی تنزلی شروع ہو گئی۔ وہ کمپنی جس کا معیار بڑھا ہوا تھا، اب گھٹ گیا تھا۔ کمپنی کے ملازمین اب بھی پہلے کی طرح تندہی سے کام کرتے تھے، حتیٰ کہ ڈجو سانپ بھی دن رات کام کر رہا تھا، لیکن پھر بھی پتہ نہیں کیوں کمپنی خسارے میں جا رہی تھی!

پخو سانپ کی راتوں کی نیندیں اُڑ گئی تھیں، کمپنی کی تنزلی نے پخو سانپ کا چین چھین لیا تھا۔ وہ کمپنی کے خسارے کی وجہ ڈھونڈ رہا تھا مگر وہ وجہ مل ہی نہیں رہی تھی۔

پھر کافی مشقت کے بعد اسے وہ وجہ مل گئی اور ناقابلِ یقین انکشاف بھی ہوا۔ اس کے پاس ثبوت آ گئے۔ اس پر حیرتوں کے پہاڑ ٹوٹے تھے۔ وہ سوچ رہا تھا کہ ایسے کیسے ہو سکتا ہے؟

اس نے ڈجو سانپ کو جا لیا اور ثبوت اس کے منہ پر مارے۔

سلمان یوسف سمیجہ

”غدار! تم نے غداری کی، میرا نقصان کیا!“ پخو سانپ اس کے سامنے ٹھہرا چلا رہا تھا۔

ایک لمحے کے لیے ڈجو سانپ گڑبڑا گیا۔

”آستین کے انسان! تم نے مجھے ڈس لیا۔ تمھارے انسانی زہر نے میری کمپنی کو برباد کر دیا۔“ پخو سانپ چیخا۔

ڈجو سانپ سکون سے اسے دیکھ رہا تھا۔

”جب میرے باعث تمھاری کمپنی نے ترقی پالی تھی تو مخالف کمپنی نے مجھے چار کروڑ دے کر یہ کام سونپا تھا۔ میں تمھاری کمپنی کے سارے راز مخالف کمپنی کو دیتا رہا۔ پھر تمھاری کمپنی کا زوال شروع ہو گیا۔ پیسوں کے لیے میں کچھ بھی کر سکتا ہوں۔“ ڈجو سانپ زہر اُگل رہا تھا۔

”یہ تم نے کیا کر دیا؟“ پخو سانپ پھر چلایا۔

”وہی کیا جس میں میرا مفاد تھا۔“ ڈجو سانپ اطمینان سے بولا۔

”زہریلے انسان!“ پخو سانپ غصے سے بولا۔

”مگر میں تو انسان نہیں، سانپ ہوں۔“ ڈجو سانپ بولا۔

”تمھاری دھوکا دہی والی عادت انسانوں والی ہے نا، تمھارے اندر انسانی زہر ہے، اس لیے تمھیں ”زہریلا انسان“ کہا۔ تمھارا زہر میری بربادی کی وجہ بنا ہے۔ تم میرے لیے انسانوں کی طرح پھن پھیلائے بیٹھے تھے اور موقع ملتے ہی مجھے ڈس بھی لیا۔ انسان کا ڈسا ہوا پانی بھی نہیں مانگتا۔ میں نے تم پر احسانات کیے اور تم نے مجھے ہی نقصان پہنچا دیا۔“ پخو سانپ آپے سے باہر ہو کر بولا۔

”سانپ کو لاٹھی سے مارنے اور ”سانپ بھی مر جائے اور لاٹھی بھی نہ ٹوٹے“ بولنے والے زمانے لد گئے۔ اب دھوکا دہی کی لاٹھی سیدھا سانپ کی ہمت پر مارو، سانپ کا کام تمام ہو جائے گا۔ میں نے بھی یہی کیا۔“ ڈجو سانپ زہریلے لہجے میں بولا۔

”کیسی انسانوں والی زہریلی سوچ ہے تمھاری، کام بھی انسانوں والے ہیں۔ میں نے تمھیں ملازمت دی، مگر مجھے کیا پتہ تھا کہ میں اپنی آستین میں ایک انسان پال رہا ہوں۔ تم مجھے اس وقت سخت زہر لگ رہے ہو۔ میں تمھیں حوالات میں بند کروا دوں گا۔ تمھیں تمھارے کیے کی سزا ملے گی۔“ پخو سانپ بلبلا کر بولا۔

”اب میں دھوکا دینے کے بعد غائب بھی انسانوں کی طرح ہو جاؤں گا۔ تم مجھے کبھی نہیں ڈھونڈ پاؤ گے۔“ یہ کہہ کر ڈجو سانپ تیزی سے بھاگنے لگا۔ پخو سانپ نے جلدی سے سیکیورٹی گارڈز کو بلایا مگر ڈجو سانپ بھاگ گیا تھا۔

☆☆☆☆☆

پُر رونق عید

اس نے کترنیں اُٹھا کر ایک طرف رکھیں کپڑوں کے تھیلے دوسری طرف رکھے۔ بال سمیٹ کر مشین پر کپڑا ڈال کر تخت سے اترنے لگی۔

کپڑوں کی سلائی کا مزید بڑا لفافہ دیکھا جنھیں سلائی کرنا تھی۔ ابھی بچوں کے سکول سے آنے کا وقت قریب تھا۔

سوا ن چار آلو کی قتلیوں کا سالن بنانے لگی۔ آٹا گوندھا رکھا تھا۔ کھانا تیار ہی ہوا تھا کہ روحان اور زینب آ گئے۔ روحان تیسری اور زینب دوسری کلاس میں تھی۔ سکول دوسری گلی میں تھا۔ برابر والی فائزہ جو اسی سکول میں استانی تھی، روحان اور زینب کو سکول لے جاتی اور لے آتی تھی۔ شام کو ان کو ٹیوشن بھی پڑھا دیتی تھی۔

بچوں کو کھانا کھلایا پھر کچھ دیر سلا دیا۔ اقبال صبح فیکٹری جاتا تھا اور شام ڈھلے تک واپسی ہوتی تھی۔

بچوں کو فائزہ کے گھر بھیج کر زبیدہ مزید کپڑوں کی کٹائی کرنے لگی۔ اپنا روزگار تھا۔ شکر تھا کہ ماں نے اسے یہ ہنر سکھا دیا۔ جہیز کی مشین چل پڑی اور گھر کی گاڑی بھی۔ یوں مہنگائی کا کچھ نہ کچھ توڑ ہونے لگا۔ اقبال محنتی بندہ تھا۔ زبیدہ صابر و شاکر عورت تھی۔ اڑھائی مرلے کا اپنا گھر تھا۔ کرائے کی بچت تھی، شام کو جب اقبال آتا تو بچے بھی پڑھ کر آ چکے ہوتے۔ زبیدہ رات کا کھانا بناتی۔ چھوٹے سے کمرے میں دری بچھا کر سب وہیں کھانا کھاتے۔ ٹی وی پر کوئی ڈرامہ دیکھتے تو زبیدہ کو اپنا گھر دنیا کے سب گھروں سے زیادہ اچھا اور پُر سکون لگتا۔ اطمینان تھا۔ اس پاک ذات کی رحمتیں اور نعمتیں یقین شکر والی زبان تھی اور صابر دل تھا۔

اقبال بھی اس کا بہت خیال رکھتا تھا۔ وہ اس کے بچوں کی ماں تھی گھر کو اچھے طریقے اور سلیقے سے سنبھالا ہوا تھا۔

کبھی کبھار وہ بچوں کو لے کر کسی پارک میں لے جاتے۔ آئس کریم یا دہی بھلے کھا کر عیاشی کرتے۔ دن سکون سے گزر رہے تھے کہ اچانک ہی ایک مشکل کا سامنا کرنا پڑ گیا۔

اقبال کی بڑی بہن صغریٰ جو بیوہ تھی شدید بیمار ہو گئی۔ وہ بھی دوسرے شہر۔ دو بیٹیاں اور ایک بیٹا تھا۔

اقبال کو جانا پڑ گیا، جمع پونجی اُٹھائے وہ بہن

فصیحہ آصف خان

کے علاج، معالجے میں لگ گیا۔ ہاتھ ایک بار پھر تنگ ہو گیا۔

''اللہ مالک ہے، زبیدہ زیرِ لب کہتی کام میں جت جاتی۔

خدا خدا کر کے صغریٰ کی حالت بہتر ہوئی، اس کا بیٹا دس جماعتیں پڑھ کر کہیں ملازمت کرتا تھا۔ بیٹیاں گھر میں پیکنگ کا کام کرتی تھیں۔ دو ماہ میں قرضہ چڑھ گیا۔ اقبال بے حد پریشان تھا۔ اللہ ساتھ ہے ناں۔ اقبال کیوں فکر کرتے ہیں۔ میں سلائی کے زیادہ کپڑے وصول کرنے کی کوشش کروں گی۔ کل فائزہ بتا رہی تھی کہ سکول میں دو نئی استانیاں آئی ہیں۔ وہ کپڑے سلوانے آئیں گی۔ زبیدہ نے اسے بھرپور تسلی دی۔ مگر اقبال جانتا تھا دونوں کو اور زیادہ محنت کرنا پڑے گی۔ اور ٹائم لگے گا، شکر تھا کہ نئی دو استانیاں فائزہ کے ساتھ اگلے دن آ گئیں اور دو، دو سوٹ سلنے کو دے گئیں۔

زبیدہ نے اللہ کا شکر ادا کیا۔

ہاشمی صاحب کی بیگم نے بھی لحاف اور تکیے کے کپڑے سلائی کرنے بھجوائے تھے۔ وہ رات دن مشین پر جھکی رہی۔

گھر کے کاموں کے ساتھ ساتھ سلائی کر، کر کے تھک کے چُور ہو جاتی ایسے میں اقبال کے محبت بھرے تسلی آمیز جملے اس کی تھکن دور کر دیتے صبح سے شام اور رات سے دن کا سلسلہ جاری تھا۔ بچوں کے سالانہ امتحان قریب آ گئے۔

اس کے بعد ماہ رمضان اور عید کی گہما گہمی شروع ہو جاتی تھی۔ زبیدہ اور اقبال باقاعدگی سے نماز و قرآن ادا کرتے، مگر ماہِ رمضان میں دونوں بہت اہتمام سے روزے رکھے، جس قدر ممکن ہوتا عبادت کرتے۔

بچوں کے کپڑے، جوتے اور دیگر اشیاء کے لیے اضافی رقم درکار تھی۔ چوں کہ عید کے تہوار پر سلائی کا کام بڑھ جاتا تھا۔ سو زبیدہ ابھی سے پلاننگ کر رہی تھی۔

شکر، شکر کر کے بچوں کے سالانہ امتحانات ختم ہو گئے۔ ہفتے بعد رمضان المبارک کے بابرکت ماہ کا آغاز ہو گیا۔

محلے کے اچھے کھاتے پیتے گھرانے، اس ماہ راشن بھیجتے اور ہمراہ رقم بھی ہوتی۔ زبیدہ مطمئن تھی کہ رب کریم کی ذات نے اسے کبھی مایوس نہیں کیا تھا۔ ہمیشہ اس کی اوقات سے بڑھ کر نوازا تھا۔ اقبال کو بھی عید پہ فیکٹری سے عید بونس ملتا تھا۔

یوں دونوں اللہ کی رحمتوں سے فیض یاب ہو رہے تھے۔

کیا سہانی مہمان گھڑیاں تھیں، سحر و افطار پر لذت رونقیں عبادتیں تھیں، تشکر و ندامت کے اشک تھے۔

کسی نہ کسی کے گھر سے پکوڑے، سموسے، جلیبیاں اور شربت آ جاتے۔ زبیدہ اللہ کا

لاکھ لاکھ شکر ادا کرتی۔

سلائی کا کام تیزی سے جاری تھا۔

گیارھویں روزے زبیدہ نے میٹھے چاول پکا کر محلے میں تقسیم کیے۔ یہ ایک روٹین بن گئی تھی۔ ہر کام ترتیب سلیقے اور وقت پر انجام پا رہا تھا۔ سب اس کی کرامت و مہربانی تھی۔

آج بیس روزے گزر گئے تھے۔ کافی سارے سوٹ سل گئے تھے۔ روحان اور زینب کے ابھی سلنے تھے۔ ایک، ایک سوٹ ریڈی میڈ لینا تھا۔

سو آج وہ سحری کے بعد ہی کام نمٹا کر بازار چلی گئی۔ بچے اس کے ہمراہ تھے، ان کے جوتے لینا تھے سو وہ ان کو ساتھ لیے قریبی بازار چلی آئی۔

کہ عید تو اصل میں بچوں ہی کی ہوتی ہے۔

بچوں کے کپڑے، جوتے، پونیاں، چوڑیاں اس نے سستے داموں خرید لیں۔ پھر سال بھر کی خواہش کو عملی جامہ پہنانے کا وقت آ گیا۔

پرلیس پر گرفت مضبوط کرتی وہ مردانے کپڑوں کی دکان میں آ گئی اور اپنی حیثیت کے مطابق سوٹ لے کر بے پناہ مسرت سے اپنے ساتھ لگائے وہ دیگر سامان اٹھائے گھر آ گئی۔

بچوں کو کھانا دے کر وہ انھیں گھر میں بٹھا کر دروازے پر تالا ڈال کر باہر چلی گئی۔ اسے اپنی پروا نہ تھی، پچھلے برس جو سوٹ سلوایا تھا جو نیا ہی تھا۔ اس کا ارادہ وہی پہننے کا تھا۔

عید تو بچوں کی ہوتی ہے۔ بچوں کی تیاری میں کوئی کمی نہ رہ جائے۔ عید آنے میں گنتی کے دن تھے اور کئی کام سمیٹنے تھے گھر کی صفائی، دھلائی، کپڑوں کی سلائی۔

خدا، خدا کر کے اس کی مہربانی سے انتیسواں روزہ آ گیا صرف ایک دو سوٹ سلنے والے رہ گئے جو عید کے بعد سلنے تھے، سو زبیدہ بھی مطمئن تھی۔

اقبال سویاں، چینی اور دیگر چیزیں لے آیا تھا۔ سال میں ایک بار ہی تو سویاں بنتی تھیں۔ زبیدہ بھنی سویاں بہت مزے کی بناتی تھی۔ چھوٹی الائچی کا تڑکہ لگنے سے خوشبو پورے گھر میں پھیل جاتی، میوہ جات الگ بہار دکھاتے۔ اقبال کئی بار استفسار کر چکا تھا کہ زبیدہ تم نے اپنے لیے عید کا جوڑا بنایا ہے کہ نہیں؟ وہ یہی کہہ کر ٹال جاتی کہ عید تو بچوں کی ہوتی ہے۔''

اقبال بار بار کہتا تھا، مگر وہ ٹال مٹول سے کام لیتی۔ اور اقبال نے کب نیا جوڑا بنوایا تھا۔ گنجائش ہی نہ نکلتی تھی۔ ایک سوٹ دو سال قبل بنوایا تھا۔ وہ درست حالت میں موجود تھا۔ اچھے موقعوں پر پہن لیتا تھا، دماغ میں یہی ہوتا کہ ''عید تو بچوں کی ہوتی ہے'' انتیسویں روزے ہی چاند کی مبارک آمد ہو گئی۔

چہروں پر بے پناہ خوشی تھی۔ ایک دوسرے کو خوشی سے مبارک باد دے رہے تھے۔ بچے بار بار اپنی چیزیں دیکھ کر نہال ہوتے کہ کب صبح عید ہو اور وہ انھیں استعمال کریں۔ عیدی وصول کریں، کب پونیاں لگیں گی، کب رنگ برنگی چوڑیاں، ہار، بندے، پہنیں گے۔

امی __ مہندی لگائیں ناں - زینب کو پھول، بوٹے والی مہندی بہت اچھی لگتی تھی، وہ مہندی لگانے پر مُصر تھی۔

ہاں_ چندا میں تمھیں فائزہ باجی کے پاس بھیجتی ہوں۔ وہی لگائے گی۔ زبیدہ نے کون مندی اٹھائی، اور بچوں کو اقبال کے ساتھ فائزہ کے گھر بھیج دیا اور خود وہ میوہ جات کترنے لگی۔

اقبال بچوں کو چھوڑ کر آ گیا تھا۔

زبیدہ نے اس کام کے بعد کپڑے استری کرنے تھے۔ اقبال اس کے سامنے آ کر بیٹھ گیا اور مسکرا رہا تھا وہ۔

بیوی بہت سگھڑ اور نیک ملی تھی، ہر کام سلیقے اور نفاست سے کرتی تھی۔ اب بھی بہت پیارے انداز میں کھوپرا کاٹ رہی تھی۔

زبیدہ یک دم اسے سر اٹھا کر دیکھتے ہوئے بولی۔

کیا دیکھ رہے ہو؟

تم بہت لگن سے کام کرتی ہو زوبی۔ کبھی کبھار وہ لاڈ میں ہوتا تو اسے زوبی، یا زیبا کہتا تھا۔

تم بھی تو بہت محنت کرتے ہو، تب ہی تو گھر کی گاڑی رواں دواں ہے۔ اللہ کا شکر ہے کہ اس نے ہمیں دوسرے کا ساتھی بنایا، کہ ہم ایک دوسرے کے ہم مزاج ہیں۔ دکھ سکھ کے ساتھی ہیں۔

زوبی تم نے سوٹ بنوایا کہ نہیں؟ اقبال کی آواز محبت آمیز سوالا تھا۔ ہمدردی تھی، اک ہلکے سے دکھ کا احساس بھی پنہاں تھا۔

ناں۔ دیکھو تو، اخراجات اتنے ہیں، مہنگائی ہے، پھر مجھے گھر میں ہی تو رہنا ہے۔ کام کرتے ہیں۔ پھر عید تو بچوں کی ہوتی ہے" کیوں ہے ناں؟ زبیدہ تفصیلاً بولی تو، اقبال۔ اچھا ذرا رکو کہہ کر ساتھ والے کمرے میں چلی گئی۔ واپس آئی تو اس کے ہاتھ میں ایک لفافہ تھا۔

اس نے اقبال کے سامنے رکھ دیا۔ اور سامنے بیٹھ گئی۔

اقبال ناسمجھی سے اسے دیکھنے لگا۔

کھولو ناں۔ وہ چاہت سے بولی۔ آنکھوں میں چمک بھری تھی۔ وہ جو لفافہ کھول رہا تھا۔ حیران بھی تھا۔ اسے دیکھ بھی رہا تھا۔

اقبال نے کھولا تو اس کے پسندیدہ رنگ کا سلا ہوا سوٹ تھا۔

یہ __ یہ کیا ہے؟ وہ حیرت آمیز مسرت سے ہکلا کر بولا۔

تمھارا عید کا جوڑا اور کیا_ زبیدہ خوشی سے نہال ہوتے ہوئے بولی۔

اچھا نہیں لگا؟ زبیدہ لگاوٹ سے بولی۔

اچھا۔ زبی جان۔ یہ تو بہت اچھا ہے، مگر تم نے کب؟ کیسے میرا مطلب ہے_ وہ سوال پہ سوال کر رہا تھا۔

چھوڑ سب۔ بس اللہ نے دیا ہے۔ تم پہنو گے کل عید ہے ناں تو نماز پڑھنے جاؤ گے۔ لوگ ملتے ہیں، مجھے بہت اچھا لگے گا کہ تم نیا جوڑا پہن کر جاؤ گے۔ زبیدہ خوش خوش بول رہی تھی

مگر تمھارا جوڑا؟ اقبال کے سوال پر وہ مسکرا دی۔

میرا کیا ہے، ''عید تو بچوں کی ہوتی ہے ناں۔ تم مرد باہر آتے جاتے ہو تو، عید کے دن نیا لباس خوب جچے گا۔

میں پانی پی آؤں۔ اقبال اچانک ہی کمرے سے باہر چلا گیا۔

زبیدہ میوہ جات سمیٹ کر استری والے کپڑے کرنے کے ارادے سے اُٹھ رہی تھی کہ اقبال نے اسے دوبارہ بیٹھنے کو کہا اس کے ہاتھ میں بھی ایک لفافہ تھا۔

یہ لو__ اس نے کندھوں سے تھام کر اسے تسلی سے بٹھاتے ہوئے کہا - زبیدہ حیرت سے اسے دیکھ رہی تھی۔ نہ سمجھ آنے والی کیفیت سے دوچار تھی۔

کھولو__ اقبال مسکرا کر بولا۔

زبیدہ نے خاموشی سے کھولا تو اس میں گلابی سلا سلایا چمکدار سوٹ تھا۔ ساتھ میں ہم رنگ دمکتی چوڑیاں تھیں۔

یہ کیا ہے؟ اقبال_ ؟ زبیدہ ابھی تک حیرت کے سمندر میں غوطہ زن تھی اب یہ نہ کہنا کہ عید تو بچوں کی ہوتی ہے۔''

ارے بچوں کی ماں کی بھی عید ہوتی ہے۔ بلکہ عید تو سب کے لیے ہوتی ہے۔ کیا بچوں کی ماں کا حق نہیں، کب سے پیسے جمع کر رہا تھا کہ اس عید پر تمھارے لیے نیا جوڑا لے سکوں۔ سو اللہ کریم نے مدد کی اور یہ رہا تمھارا عید کا جوڑا اور چوڑیاں۔ پسند آئے؟ اقبال محبت سے چور لہجے میں اس کی چمکتی آنکھوں میں دیکھ کر بولا۔

بہت__ بہت خوبصورت ہے۔ اور چوڑیاں بھی میری پسند کی ہیں۔ زبیدہ حقیقت میں پُر جوش ہو کر بولی۔

اقبال جیسا شریف، خیال رکھنے والا، محنتی انسان اس کا نصیب تھا۔ زبیدہ نے عقیدت سے اقبال کے ہاتھ تھام لیے۔ اقبال نے گرم جوشی سے اس کے ہاتھ اپنے ہاتھوں میں لے کر دبائے اور بے پایاں محبت کا اظہار کر ڈالا کہ کل عید کا دن ان کے چھوٹے سے گھر میں خوشی کی طرح رقص کرنے کو بے قرار تھا۔

☆☆☆☆☆

اصل نقل

جیفرے آرچر جدید برطانیہ کا عظیم کہانی نویس ہے۔ وہ 1940 میں پیدا ہوا۔ اس نے آکسفورڈ کے ڈیلنگٹن سکول اور بریزنوز میں تعلیم پائی۔ 1960 کی دہائی میں سو میٹر کی دوڑ میں اس نے آکسفورڈ، سمرسٹ اور برطانیہ کی نمائندگی کی۔ ضمنی انتخاب میں لاؤتھ کے حلقہ سے جیت کر 1969 میں وہ دارالعوام کا سب سے کم عمر ممبر پارلیمنٹ بن گیا۔ 1976 تک وہ برطانیہ پارلیمنٹ کا رکن رہا، جس کے بعد اس نے اپنا پہلا ناول شائع کرایا۔ ستمبر 1985 میں وہ کنزرویٹو پارٹی کا ڈپٹی چیئرمین بنایا گیا۔ 1987 میں اس کا پہلا پلے لندن کے ویسٹ اینڈ میں سٹیج کیا گیا۔ جیفرے آرچر شادی شدہ ہے اور دو بچوں کا باپ ہے۔ وہ لندن اور کیمبرج میں رہائش رکھتا ہے۔ ابتک اس کی متعدد کتب منظر عام پر آچکی ہیں۔ یہ کہانی اس کی کتاب A Twist In The Tale سے لی گئی ہے۔

جیفرے آرچر

ترجمہ: پیروز بخت قاضی

ایک سال سے زائد عرصہ ہو گیا تھا کہ جیرالڈ ہیسکنز اور والٹر ریمز باٹم کارن فلیکس کھا رہے تھے۔

''میں اپنے MC اور DSO کے تمغوں کا تبادلہ تمھارے VC کے تمغہ سے کرلوں گا۔'' والٹر نے ایک صبح سکول جاتے ہوئے کہا۔

''کبھی نہیں'' جیرالڈ نے کہا۔ ''ایک VC دس پیکٹوں کے خول دے کر ملتا ہے، لیکن ایک MC یا DSO کے لیے صرف دو خول کافی ہیں۔''

جیرالڈ پیکٹوں کے خول جمع کرتا رہا حتیٰ کہ اس نے وہ تمام میڈل اکٹھے کر لیے جو پیکٹوں پر بنے تھے۔ والٹر کبھی VC حاصل

نہ کر سکا۔
اینجلا بریڈ بری سمجھتی تھی کہ دونوں بیوقوف ہیں۔
''وہ صرف اصل کی نقل ہیں'' وہ انھیں بار بار یاد دلاتی۔ ''وہ اصل میڈل نہیں ہیں اور مجھے صرف اصلی میڈلوں سے دلچسپی ہے۔ وہ ان کو متکبرانہ انداز میں بتاتی۔
جیرالڈ اور والٹر دونوں اس وقت اینجلا کی رائے کی پروا نہ کرتے تھے۔ دونوں لڑکے ابھی جنسِ مخالف کی نسبت میڈلوں میں زیادہ دلچسپی رکھتے تھے۔
کیلاگ کارن فلیکس کی پیشکش یکم جنوری 1950 کو ختم ہو گئی۔ اس وقت تک جیرالڈ نے اپنا سیٹ مکمل کر لیا تھا۔ والٹر نے کارن فلیکس کھانا بند کر دیا۔
1950 کی دہائی میں بچوں کو Meccano کی دنیا سے روشناس کرایا گیا۔ مکینو حاصل کرنے کے لیے اور زیادہ کارن فلیکس کھانے کی ضرورت تھی۔ جیرالڈ نے سال بھر کے اندر کافی سیٹ جمع کر لیے تھے جن سے وہ پُل، کرین، کشتی، بحری جہاز اور آفس بلاک بنا سکتا تھا۔
جیرالڈ کے اہل خانہ کارن فلیکس چباتے رہے لیکن جب اس نے انھیں بتایا کہ وہ پورا شہر تعمیر کرنا چاہتا تھا جو کیلاگ کی آخری پیشکش تھی تو اس کے تمام ہم جماعتوں کی مدد درکار تھی جو ہل گرامر سکول کے پانچویں درجہ میں زیرِ تعلیم تھے۔ وہ سب ناشتہ میں کارن فلیکس استعمال کرتے تو جیرالڈ کی خواہش پوری ہو سکتی تھی۔
والٹر نے ایسی مدد سے انکار کر دیا۔ اینجلا کی مدد طلب ہی نہ کی گئی تھی۔ تینوں اپنے علیحدہ راستوں پر چلتے رہے۔
دو برس بعد جب جیرالڈ ہسکنز کو ڈرہم یونیورسٹی میں داخلہ مل گیا تو کسی کو یہ سن کر تعجب نہیں ہوا کہ اس نے انجینئرنگ کے مضامین کا انتخاب کیا تھا اور اپنا مشغلہ میڈل جمع کرنا تحریر کیا تھا۔
والٹر ریمز باٹم اپنے والد کے جیولری کے کاروبار میں شریک ہو گیا اور اینجلا بریڈ بری کے ساتھ گھومنے پھرنے لگا۔
جیرالڈ ڈرہم میں سیکنڈ ایئر کا طالب علم تھا۔ وہ جب موسم بہار کی تعطیلات میں گھر آیا تو اس کی ملاقات والٹر اور اینجلا سے دوبارہ ہوئی۔ ٹاؤن ہال میں باخ میوزک کنسرٹ تھا اور وہ ایک ہی قطار میں بیٹھے تھے۔ والٹر نے انٹرول کے دوران اسے بتایا کہ وہ حال ہی میں ایک دوسرے سے منسوب ہوئے تھے لیکن شادی کی ابھی کوئی تاریخ نہ طے ہوئی تھی۔
جیرالڈ نے سال سے زیادہ عرصہ ہُوا اینجلا

کو نہ دیکھا تھا لیکن اس مرتبہ اس نے اینجلا کے خیالات کو غور سے سنا تھا کیونکہ والٹر کی طرح وہ بھی اس سے محبت کرنے لگا تھا۔

کارن فلیکس کھانے کے بجائے اب جیرالڈ ہر روز اینجلا کو کھانے کی دعوت دینے لگا۔ وہ اس کوشش میں تھا کہ اپنے پرانے حریف سے اینجلا کو جیت لے۔

جیرالڈ کو ایک اور کامیابی ملی جب اینجلا نے کرسمس سے چند روز قبل والٹر کی منگنی کی انگوٹھی واپس کر دی۔

والٹر نے ہر طرف مشہور کر دیا کہ جیرالڈ محض اس لیے اینجلا سے شادی کا خواہاں ہے کیونکہ لڑکی کا والد بل سٹی کی سہولیات کمیٹی کا چیئرمین ہے اور وہ ڈرہم سے ڈگری حاصل کرنے کے بعد کونسل میں ملازمت کا طلبگار ہے۔ جب شادی کے دعوت نامے بھیجے گئے تو والٹر کا نام مہمانوں کی فہرست میں شامل نہ تھا۔

شادی کے بعد مسٹر اور مسز بیسکنز ہنی مون منانے کے لیے ملٹیویا چلے گئے کیونکہ نائس جانے کے اخراجات ان کی پہنچ سے باہر تھے او وہ کلیتھو رپس نہ جانا چاہتے تھے۔ بہرحال مقامی ٹریول ایجنٹ میلٹیویا کی خصوصی آفر دے رہا تھا جو آسٹریا اور چیکو سلاویکیہ کے درمیان چھوٹی سی بادشاہت تھی ۔ جب نوبیاہتا اس بادشاہت کے صدر مقام ٹیسک کے ہوٹل میں پہنچے تو انھیں پتا چلا کہ اخراجات کم کیوں تھے۔

ملٹیویا کو 1959 میں اپنی شناخت کا مسئلہ درپیش تھا۔ یہ مملکت ایک اور معاہدہ کے بعد اپنے معاملات ایڈجسٹ کر رہی تھی۔ یہ معاہدہ ایک ولندیزی قانون دان نے جینوا میں بیٹھ کر فرانسیسی زبان میں تحریر کیا تھا جبکہ اس کے ذہن میں روسی اور امریکی تھے ۔ بہرحال شاہ الفانس سوئم جیسے ہر دلعزیز حکمران کی کامیاب حکمت عملی کا نتیجہ تھا کہ مملکت کو مغربی ممالک سے ملنے والی امداد جاری رہی اور سوشلسٹ ممالک کے راہنماؤں کی بھی آمدورفت جاری رہی۔

مسٹر اور مسز بیسکنز کو جلد ہی معلوم ہو گیا کہ جون میں صدر مقام کا اوسط درجہ حرارت 92 فارن ہائٹ تھا۔ بارش مفقود تھی اور دوسری جنگ عظیم کی بمباری کی وجہ سے سیوریج سسٹم کے کھنڈرات یا باقیات تھے۔

اینجلا گلیوں بازاروں میں چلتے ہوئے ہر وقت اپنی ناک پر رومال رکھتی۔ پیپلز ہوٹل میں کہنے کو پینتالیس کمرے تھے لیکن حقیقت یہ تھی کہ ان میں سے صرف تین

کے ساتھ ہاتھ روم تھے اور ان میں بھی پلگ مفقود تھے۔ پھر خوراک بھی ناقص اور غیر معیاری تھی۔ وہاں جیرالڈ کا زندگی میں پہلی بار وزن کم ہوا تھا۔

ہنی مون منانے والے جوڑے کو بھی معلوم ہوا کہ ملٹیویا میں کوئی قومی یادگار، آرٹ گیلری اور قابلِ ذکر تھیٹر یا اوپیرا ہاؤس نہ تھا۔ شہر سے باہر کا علاقہ کیمبرج شائر سے بھی زیادہ ناہموار، دلدلی اور غیر دلچسپ تھا۔ مملکت کا کوئی ساحل سمندر نہ تھا۔ صرف ایک دریا پلونز تھا جو جرمنی سے آتا تھا اور پھر روس میں داخل ہو جاتا تھا۔ اس دریا کا کسی کو اعتبار نہ تھا۔

ہنی مون کے اختتام پر انھیں یہ معلوم کر کے خوشی ہوئی تھی کہ ملٹیویا کی کوئی قومی ایئر لائن نہ تھی۔ وہ برٹش ایئرویز کے جہاز میں بحفاظت وطن واپس پہنچے۔ جیرالڈ کے لیے یہ ملٹیویا کے تجربہ کا اختتام ہوتا اگر وہاں سیوریج کا بل کہ سیوریج کے نقدان کا مسئلہ نہ ہوتا۔ ہل شہر میں واپس آ کر جیرالڈ نے سٹی کونسل کے انجینئرنگ ڈیپارٹمنٹ میں اسسٹنٹ کے طور پر ملازمت شروع کی۔ اس کی پہلی تعیناتی بطور تھرڈ انجینئر ہوئی جہاں اس کی خصوصی ذمہ داری شہر کا سیوریج تھا۔ زیادہ تر نوجوان ایسی تعیناتی کو زندگی کے زینے کی پہلی سیڑھی سے زیادہ اہمیت نہ دیتے لیکن جیرالڈ کا معاملہ مختلف تھا۔ اس نے جلد ہی تمام مشہور سیوریج کمپنیوں سے رابطہ کیا اور ان کے مشیروں اور انجینئروں کے بارے میں معلومات حاصل کیں۔

دو سال کے بعد جیرالڈ نے اپنے سُسر کی کمیٹی میں ایک تحقیقی جائزے کا پیپر پیش کیا، جس میں بتایا گیا تھا کہ کس طرح سٹی کونسل شہر کے سیوریج سسٹم کو بہتر بنا کر ٹیکس دہندگان کا کثیر سرمایہ بچا سکتی ہے۔ کمیٹی نے اس کی تجاویز کو مفید پا کر منظوری دے دی اور ان تجاویز کو عملی جامہ پہنانے کا حکم دے دیا۔ اس موقع پر جیرالڈ کو بطور سیکنڈ انجینئر ترقی دی گئی۔

انھیں دنوں والٹر ریمز باٹم نے پہلی بار کونسل ممبری کا انتخاب لڑا لیکن وہ کامیاب نہ ہو سکا۔

تین سال بعد جب چھوٹی چھوٹی سرنگوں اور پانی کی نالیوں کا نظام مکمل ہو گیا تو جیرالڈ کی محنت کے صلہ میں اسے بطور ڈپٹی بروا انجینئر تعینات کر دیا گیا۔ اسی سال اس کا سُسر میئر بن گیا اور والٹر بطور کونسلر منتخب ہو گیا۔

ملک بھر کی سٹی کونسلیں اب جیرالڈ کی قابلیت کا اعتراف کرتی تھیں اور جہاں کہیں سیوریج کا مسئلہ پیدا ہوتا جیرالڈ کی

رائے لی جاتی۔ اگرچہ جیرالڈ کے متعلق روٹری کلب کے ہر ڈنر میں لطیفے بھی بنائے جاتے لیکن اسے اپنے شعبہ میں ایک اتھارٹی بھی مانا جاتا تھا۔ 1966 میں ہیلی فیکس بروسیوریج سسٹم بنانے کے لیے جب ٹینڈر جاری کرنے لگے تو پہلے کیرل سے ماہرانہ مشورہ لیا گیا۔ ہیلی فیکس ٹاؤن کونسل کے انجینئروں کے ہمراہ پورا دن گزارنے کے بعد یہ جان کر کہ نئے سیوریج نظام پر کتنی رقم خرچ ہوگی جیرالڈ نے اپنی بیوی کو کہا ''جہاں وسائل زیادہ ہوں وہاں کمائی بھی زیادہ ہوتی ہے۔'' لیکن ایتھلا کے ذہن میں یہ تجویز آئی کہ کس طرح اس کا شوہر کم سے کم رسک لے کر کتنا کما سکتا ہے۔ اگلے چند روز میں جیرالڈ نے اپنی بیوی کی تجویز پر غور کیا اور اگلے ہفتے ہیلی فیکس آکر مڈلینڈ بینک گیا۔ جیرالڈ نے میڈلینڈ بینک اتفاقاً نہیں چنا تھا۔ مڈلینڈ بینک کا منیجر ہیلی فیکس بروکونسل کی پلاننگ کمیٹی کا چیئرمین بھی تھا۔

دونوں افراد کے مفاد میں معاہدہ طے پا گیا اور بینک کی حمایت میں جیرالڈ نے ڈپٹی انجینئر کے عہدہ سے استعفیٰ دے دیا اور اپنی پرائیویٹ کمپنی بنالی۔ جب اس نے اپنے ٹینڈر پیش کیے تو وہ لندن کی کئی دوسری کمپنیوں کے مقابلے میں منظور کر لیے گئے اور پلاننگ کمیٹی نے اتفاق رائے سے ہیسکنز کمپنی کو ٹھیکہ دے دیا۔

تین سال بعد ہیلی فیکس کا عمدہ نیا سیوریج سسٹم موجود تھا، ورمڈلینڈ بینک کے پاس ہیسکنز کمپنی کا اکاؤنٹ تھا۔ اگلے پندرہ برسوں کے دوران چیسٹر، رن کارن، ہڈرزفیلڈ، ڈارلنگٹن اور یارک کے شہر علیحدہ علیحدہ اور مشترکہ طور پر جیرالڈ ہیسکنز کی خدمات کے لیے ممنون تھے۔

پھر ہیسکنز اینڈ کمپنی انٹرنیشنل نے دوبئی، لاگوس اور ریو ڈی جینز میں ٹھیکے لیے۔

1983 میں جیرالڈ کو شاہی ایوارڈ اور اس سے اگلے برس ملکہ نے اسے کمانڈر آف دی برٹش ایمپائر CBE کا اعزاز عطا کیا۔ اعزاز کی تقریب بکنگھم پیلیس میں اسی سال منعقد ہوئی جب ملیشیا کے شاہ الفانس سوئم کا انتقال ہوا اور اس کا بیٹا الفانس چہارم تخت نشین ہوا۔ نئے بادشاہ نے فیصلہ کیا کہ ٹیسک شہر کے نکاسیٔ آب کے لیے کچھ کرنا پڑے گا۔ اس کے والد کی وصیت تھی کہ رعایا کو بدبو سے نجات ملنی چاہیے اور الفانس چہارم یہ مسئلہ اپنے بیٹے کے لیے چھوڑ کر نہ جانا چاہتا تھا۔

کافی مانگ تانگ کر اور مغرب سے قرض لے کر اور مشرقی یورپ کے ممالک کے دورے اور مذاکرات کے بعد نئے شاہ نے

بالآخر مملکت کے صدر مقام کا نیا سیوریج بنانے کے لیے ٹینڈر طلب کیے۔ دنیا بھر کی بڑی بڑی انجینئرنگ فرموں میں کی کئی صفحات کی تفصیلات پر غور ہوا۔ ٹینڈرز کی دستاویزات پر میٹنگوں میں بحثیں ہوئیں۔ کاغذات کی جانچ کا اور متوقع منافع کا جائزہ لیا گیا۔ شاہ الفانس کو چند جوابات ہی موصول ہوئے۔ شاہ ساری رات بیٹھ کر بین کیمرون کا موازنہ کرتا رہا جنھوں نے دلچسپی کا اظہار کیا تھا۔ بات سمجھ گیا تھا اور جب شاہ کو یہ علم ہوا کہ کوئی پچیس برس قبل جیرالڈ نے اپنے ہنی مون کے لیے ملٹیو یا کا انتخاب کیا تھا تو اس کا جھکاؤ اس کی طرف ہو گیا۔ الفانس جہارم نے بستر پر جانے سے پہلے ہیسکنز اینڈ کمپنی انٹرنیشنل کا ٹینڈر منظور کرنے کا فیصلہ کر لیا۔

اس مرتبہ جیرالڈ ہیسکنز نے دوبارہ ملٹیو یا کا سفر اختیار کیا لیکن اس کے ہمراہ ایک سائٹ انجینئر بھی تھا اور تین ڈرافٹسمین اور گیارہ انجینئروں کی ٹیم بھی اس کے ساتھ گئی تھی۔ جیرالڈ کی شاہ کے ساتھ علیحدگی میں ملاقات ہوئی جس میں اس نے شاہ کو یقین دلایا کہ سکیم وقت پر مقررہ خرچ سے مکمل کی جائے گی۔ اس نے شاہ کو یہ بھی بتایا کہ وہ اس کے ملک میں دوبارہ آ کر کتنا خوش تھا۔ البتہ انگلستان واپس آ کر اس نے اپنی بیوی کو بتایا کہ ابھی بھی ملٹیو یا میں سات بجے شام کے بعد کسی تفریح کا سامان میسر نہیں۔

چند برس بعد رو میٹریل کی قیمتوں میں اضافہ کی وجہ سے کافی لے دے کے بعد ٹیسک میں مشرقی یورپ کا ایک نہایت عمدہ سیوریج سسٹم بن چکا تھا۔ شاہ بہت مسرور تھا اگرچہ وہ اس امر کا شاکی تھا کہ ہیسکنز اینڈ کمپنی نے ٹھیکہ کی اصل لاگت سے تجاوز کیا تھا۔ زائد اخراجات کی بابت شاہ کو کئی بار وضاحت کرنا پڑی اور شاہ جان گیا تھا کہ زائد اڑھائی لاکھ پاؤنڈ کی رقم مغرب سے قرض لینا پڑے گی اور اس کے لیے مشرقی یورپ کے سامنے کئی وضاحتیں کرنا ہوں گی۔ کئی پوشیدہ دھمکیوں والے خطوط لکھ کر اور وکیلوں کے مشورہ کے مطابق کاروائیاں کر کے ہیسکنز اینڈ کمپنی کو آخری وصولی ہوئی اور وہ بھی اس وقت جب شاہ کو برطانوی حکومت نے مزید امداد فراہم کی۔ یہ رقم ملٹیو یا کو ادا نہیں کی گئی بل کہ مڈلینڈ بینک کے حساب میں جمع کرائی گئی۔ جیرالڈ نے اپنی بیوی کو بتایا کہ غیر ملکی امداد عام طور پر اسی طرح تقسیم کی جاتی ہے۔

جیرالڈ ہیسکنز اور ٹیسک شہر کی نکاسیٔ آب کے منصوبہ کی کہانی یہیں ختم ہو جاتی اگر

برطانوی وزیر خارجہ نے ملٹیو یا کی مملکت کا دورہ نہ کرنا ہوتا۔

وزیر خارجہ کے دورے کا اصل مقصد وارسا اور پراگ جا کر روس کی گلاس ناسٹ اور پریسٹرائیکا پالیسی کا جائزہ لینا تھا لیکن جب وزیر خارجہ کو معلوم ہوا کہ ملٹیو یا کو کافی امداد فراہم کی گئی ہے اور جب وزیر خارجہ ہوا کہ ملٹیو یا کو کافی امداد فراہم کی گئی ہے اور جب وزیر خارجہ کو اس بفرسٹیٹ کی اہمیت بتائی گئی تو وزیر خارجہ نے شاہ الفاس کی پرانی دعوت پر اس کے ملک جانا قبول کر لیا تھا۔ چھوٹے ممالک کے اس قسم کے دورے عام طور پر برطانوی وزرائے خارجہ ایئر پورٹ کے لاؤنج تک محدود رکھتے ہیں۔ یہ ریت ہنری کیسنجر اور بعد ازاں کامریڈ گورباچوف نے ڈالی تھی لیکن اس بار محسوس کیا گیا کہ ملٹیو یا میں پورے دن کا دورہ رکھنا چاہیے۔

جیرالڈ کے ہنی مون کے بعد سے ہوٹلوں میں معمولی فرق پڑا تھا اس لیے وزیر خارجہ کو شاہی محل میں قیام کی دعوت دی گئی تھی۔ شاہ نے اس مختصر قیام کے دوران دو تقریبات کا اہتمام کیا تھا۔ ایک شہر کے لیے سیوریج کا افتتاح تھا اور دوسری سرکاری دعوت طعام۔

جب وزیر خارجہ نے دونوں سرکاری تقریبات کی دعوت قبول کر لی تو شاہ نے جیرالڈ نے اور اس کی بیوی کو اپنے خرچہ پر رسم افتتاح پر آنے کی دعوت دی۔ افتتاح کی تقریب پر وزیر خارجہ نے موقع کی مناسبت سے اپنی تقریر کی۔ اس نے پہلے جیرالڈ ہیسکنز کی اعلیٰ کارکردگی کو سراہا جو برطانوی انجینئرنگ کی روایت کے مطابق تھی۔ اس کے بعد ملٹیو یا کی عقلمندی کی تعریف کی کہ برطانوی کمپنی کو ٹھیکہ دیا گیا۔ وزیر خارج نے اس حقیقت کا ذکر نہیں کیا کہ سارے منصوبہ کا خرچہ برطانوی حکومت نے دیا تھا۔ جیرالڈ وزیر خارجہ کے الفاظ سے بہت متاثر ہوا تھا، جس نے وزیر خارجہ کے ہاتھوں سیلوس گیٹ کھول کر افتتاح کرنے کے بعد وزیر موصوف کو اپنے احساسات بتائے۔

اس شام شاہی محل میں دعوت منعقد ہوئی جس میں تین سو سے زائد مہمان آئے تھے۔ مہمانوں میں سفرا اور برطانوی تاجر بھی شامل تھے۔ وہاں معمولی تقاریر ہوئیں جن میں برطانوی شاہی خاندان سے خصوصی تعلقات کا ذکر کیا گیا۔ شام کی تقریب کا اہم حصہ وہ تھا جب شاہ نے دو اعزازات تقسیم کیے۔ پہلا ایوارڈ وزیر خارجہ کو دیا گیا، جس کا نام آرڈر آف ٹی کاک (سیکنڈ کلاس) تھا، یہ اعزاز اعلیٰ ترین اعزاز تھا، جو کسی کو دیا جا سکتا تھا کیونکہ آرڈر آف پی کاک

(فرسٹ کلاس) شاہی افراد اور سربراہ مملکت کو ہی دیا جا سکتا تھا۔ اس امر کی وضاحت شاہ نے اپنی تقریر میں کر دی تھی۔
اس کے بعد شاہ نے دوسرے اعزاز کا اعلان کیا جو جیرالڈ ہیسکنز کمانڈر آف دی برٹش امپائر کے لیے تھا اور جس کا نام آرڈر آف دا پی کوک (تھرڈ کلاس) تھا یہ ڈسکہ شہر کے __ نکاسیٔ آب کے سلسلہ میں اس کی خدمات کے اعتراف کے طور پر دیا گیا۔ جیرالڈ کے لیے یہ باعث حیرت وانبساط تھا۔ جب اسے سٹیج کے اوپر لے جایا گیا جہاں شاہ نے آگے جھک کر ایک لمبی طلائی زنجیر اس کے سر کے اوپر سے گلے میں ڈال دی جس میں مختلف رنگوں کے قیمتی پتھر جڑے تھے۔ جیرالڈ احتراماً دو قدم پیچھے ہٹ کر جھکا۔ وزیر خارجہ نے ہمت افزائی کے لیے مسکرا کر اس کی طرف دیکھا۔
اس رات جیرالڈ آخری غیر ملکی مہمان تھا جو تقریب سے واپس اپنے ہوٹل میں آیا۔ اس نے طلائی زنجیر بستر پر رکھی، کپڑے تبدیل کیے اپنی بیوی کی طرف دیکھا جو ابھی تک سو رہی تھی۔ اور پھر طلائی زنجیر سر کے اوپر سے لا کر گلے میں ڈالی جو کندھے پر ٹک گئی۔ غسل خانہ کے آئینہ کے سامنے کھڑے ہو کر جیرالڈ خود کو دیکھتا رہا۔ وہ گھر واپس پہنچنے تک انتظار نہ کر سکتا تھا۔
ہل شہر میں اپنے گھر پہنچتے ہی اس نے وزارت خارجہ کے نام خط ڈکٹیٹ کرایا۔ اس نے حکومت سے اجازت مانگی تھی کہ وہ ان تمام تقریبات میں اپنا ایوارڈ پہن سکے جن تقریبات کے دعوت ناموں کے نیچے دائیں کونے میں لکھا ہو کہ ''اعزازات، تمغے اور میڈل پہن کر تشریف لائیں۔'' دفتر خارجہ نے معاملہ ملکہ برطانیہ کو بھیجا جو شاہ الفانس چہارم کی دور کی کزن تھی اور ملکہ نے درخواست منظور کر لی۔
اگلی سرکاری تقریب جس میں جیرالڈ آرڈر آف دی پی کاک جسم پر سجا سکتا تھا ہل سٹی ہال میں منعقد ہو رہی تھی، جس میں نئے میئر نے عہدہ سنبھالنا تھا۔ اس کے بعد گلڈ ہال میں ڈنر تھا۔
جیرالڈ اس تقریب کے لیے لاگوس سے خصوصی طور پر آیا تھا کپڑے تبدیل کرنے سے بھی پہلے وہ آرڈر آف دی پی کاک (تھرڈ کلاس) کو دیکھے بنا نہ رہ سکا۔ اس نے میڈل کا بکس کھولا اور اسے بے یقینی سے دیکھنے لگا۔ سونا داغدار اور بے چمک ہو چکا تھا اور ایک قیمتی پتھر کا نگینہ ڈھلا ہو چکا تھا۔ مسز ہیسکنز اپنے بال سنوارتے ہوئے رکی اور ایک نگاہ تمغہ کی طرف دیکھا۔ ''یہ سونا نہیں ہے'' اس نے اعلان کیا۔ مسز ہیسکنز

نے اتنی سادگی سے فیصلہ سنایا کہ انٹرنیشنل مونیٹری فنڈ بھی اپنا راستہ بھول جاتا۔

جیرالڈ نے کوئی تبصرہ نہ کیا اور جلدی سے ڈھیلا پتھر ایرلڈانیٹ کے ساتھ اپنی جگہ پر چپکا دیا لیکن جیرالڈ نے دل ہی دل میں تسلیم کرلیا کہ بنانے والے کی صناعتی ناقص تھی۔ دونوں میں سے کسی نے بھی سٹی ہال کے لیے سفر کے دوران اس گلڈ ہال میں میئر کے ڈنر کے بعد بعض مہمان آرڈر آف دی پیکاک (تھرڈ کلاس) کی تاریخ دریافت کرتے رہے۔ اگرچہ جیرالڈ کو ایسی دریافت سے بڑی تسکین حاصل ہوئی اور اس نے وضاحت کی کہ کس طرح اس ایوارڈ کا مستحق قرار دیا گیا اور ملکہ نے اسے خاص موقع پر میڈل لگانے کی اجازت دی۔ تاہم اس نے محسوس کیا ایک یا دو ساتھی داغدار پی کاک سے مرعوب نہ ہوئے تھے۔ جیرالڈ نے یہ بھی محسوس کیا کہ بدقسمتی سے یہ گفتگو اسی میز پر ہوئی تھی جس پر والٹر ڈیمز بانم بھی بحیثیت ڈپٹی میئر موجود تھا۔

''میرے خیال میں اس کی صحیح قیمت لگانا مشکل ہوگا'' والٹر نے طلائی زنجیر کی طرف حقارت سے دیکھتے ہوئے کہا۔

''یقیناً یہ ممکن ہوگا'' جیرالڈ نے زور دے کر کہا۔

''میرا مطلب اس کی سکّوں میں قیمت نہ تھا'' جوہری نے کہا۔ ''کیونکہ کرنسی میں اس کی قیمت لگانا بہت سہل ہوگا۔ البتہ میری مراد اس کی جذباتی قیمت تھی۔''

''بیشک'' جیرالڈ نے کہا ''اور کیا آپ آئندہ برس میئر بننے کی توقع رکھتے ہیں؟'' اس نے موضوع بدلتے ہوئے دریافت کیا۔

''روایت تو یہی ہے'' والٹر نے بتایا ''کہ میئر کی جگہ اگلے برس ڈپٹی میئر کو ملتی ہے۔'' اس نے جیرالڈ کو یقین دلایا کہ تب وہ اسے بالائی میز پر نشست دلوائے گا۔ والٹر تھوڑی دیر رُک کر بولا ''معلوم ہونا چاہیے کہ میئر کی زنجیر چودہ قیراط سونے کی ہوتی ہے۔''

اس شام جیرالڈ دعوت سے جلدی سے اُٹھ کر چلا گیا۔ اس کا پکا ارادہ تھا کہ والٹر کے میئر بننے سے پیشتر آرڈر آف دی پیکاک کا کچھ کرنا ہوگا۔

جیرالڈ کے دوستوں میں سے کوئی بھی اسے فضول خرچ نہ کہہ سکتا تھا۔ اس کی خود پسندی کی لہر پر اس کی بیوی بھی حیران تھی۔ اگلی صبح نو بجے جیرالڈ نے دفتر فون کر کے بتایا کہ وہ اس روز کام پر نہ آئے گا۔ پھر وہ بذریعہ ٹرین لندن چلا گیا جہاں وہ بانڈ سٹریٹ اور پھر ایک مشہور

جوہری کی دکان پر پہنچا۔

بانڈ سٹریٹ کی دکان کا دروازہ اک سارجنٹ نے جیرالڈ کے لیے کھولا۔ اندر جا کر اس نے اپنا مسئلہ سیاہ سوٹ میں ملبوس دراز قد شخص کے آگے بیان کیا جس نے جیرالڈ کو خوش آمدید کہا تھا۔ اسے شیشے کے ایک بیضوی کاؤنٹر پر لے جایا گیا جو دکان کے وسط میں تھا۔

''ہمارے مسٹر پولنگر اسی وقت آپ کے پاس ہوں گے۔'' اسے یقین دلایا گیا۔

چند ہی لمحوں بعد ہیروں کا ماہر پہنچ گیا۔ پولنگر نے جیرالڈ کی خواہش پر آرڈر آف دی پیکاک (تھرڈ کلاس) کو دیکھا اور زنجیر کو سیاہ ویلویٹ پر رکھ کر ایک خصوصی شیشے کے ذریعے قیمتی پتھروں کا معائنہ کیا۔ ایک سرسری جائزہ لے کر مایوسی سے اپنی بھنویں سکیڑیں۔

''تو اس کی کیا قیمت ہے؟'' کئی منٹ گزرنے کے بعد جیرالڈ نے براہ راست سوال کیا۔

''ایسی معمولی چیز کی قیمت لگانا بہت مشکل ہے'' پولنگر ہچکچاتے ہوئے بولا۔ ''ہیرے شیشے کے اور سونا پیتل کا ہے نا؟ آپ یہی کہنا چاہتے ہیں؟''

پولنگر نے یوں دیکھا جیسے اس سے بہتر الفاظ میں ایوارڈ کی قیمت نہ بتا سکتا تھا۔

''آپ شاید کسی ایسے شخص سے چند سو پونڈ حاصل کر سکیں جسے ایسی چیزیں جمع کرنے کا شوق ہو لیکن.....''

''اوہ نہیں'' جیرالڈ نے بتایا ''مجھے اس کی فروخت میں کوئی دلچسپی نہیں۔ میرا لندن آنے کا مقصد یہ معلوم کرنا تھا کہ آپ اس کی نقل تیار کر سکتے ہیں۔''

''اس کی نقل؟'' ماہر نے حیرانگی سے پوچھا۔

''ہاں نقل'' جیرالڈ بولا ''پہلی بات میں یہ چاہتا ہوں کہ ہر پتھر رنگ کے مطابق اصلی ہو۔ دوسری بات یہ کہ جڑاؤ اس مہارت کا ہو کہ ایک نوابزادی کو بھی متاثر کر دے۔ اور تیسری بات یہ کہ اٹھارہ قیراط سے کم کوالٹی کا سونا نہ لگایا جائے۔''

دکان کا ماہر جوہری جو کئی عرب گاہک بھی دیکھ چکا تھا اپنی حیرت کو پوشیدہ نہ رکھ سکا۔

''آپ کو معلوم ہونا چاہیے کہ میرے لیے یہ زندگی میں ایک بار ملنے والا اعزاز ہے۔ مجھے کب تک لاگت کا تخمینہ مل سکے گا؟''

''یہ سستا نہیں پڑے گا اور تخمینہ لگانے میں ایک ماہ یا چھ ہفتے لگ جائیں گے۔'' ماہر جوہری نے جواب دیا۔

جیرالڈ جوہری کی دکان کے پلش قالینوں سے نائیجیریا کی گندی نالیوں کی طرف چلا گیا۔ جب ایک ماہ بعد وہ ہوائی جہاز میں لندن واپس آیا تو ویسٹ اینڈ میں مسٹر

پولنگر سے دوسری ملاقات کے لیے گیا۔
جوہری جیرالڈ ہسکنز کو اور اس کی اچھوتی خواہش کو نہ بھولا تھا۔ اس نے اپنی آرڈر بک سے ایک تہہ کیا ہوا کاغذ کا پرزہ نکالا۔ جیرالڈ نے کاغذ کھولا اور تحریر پڑھنے لگا۔
کسٹمر کے کام کے لیے ضروری اشیاء بارہ ہیرے۔ سات ایسے تھیسٹ، تین یاقوت اور ایک نیلم، تمام بہترین رنگت کے اور اعلیٰ کوالٹی کے۔ ایک مور جو ہاتھی دانت سے بنایا جائے گا، ایک ماہر دستکار مینا کاری کرے گا۔ پوری زنجیر اٹھارہ قیراط کے عمدہ سونے سے ڈھالی جائے گی۔ نیچے سرخ لکیر ہوگی۔ قیمت دو لاکھ گیارہ ہزار پونڈ۔''
جیرالڈ چھت کے میٹریل، بھاری مشینری کے کرایہ یا ادائیگیوں کے بل کے سلسلہ میں چند ہزار پونڈ کے تخمینے پر کانٹ چھانٹ یا کمی بیشی کی کوشش تو کرتا لیکن اس نے جوہری سے صرف یہ پوچھا کہ وہ کب تیار شدہ چیز لے سکے گا۔
''یقین سے تو نہیں کہا جا سکتا کہ اتنی عمدہ چیز کی تیاری میں کتنا وقت لگے گا'' مسٹر پولنگر نے کہا ''میرے خیال میں صحیح قسم اور رنگ کے پتھروں کے انتخاب میں کچھ وقت لگے گا۔'' کچھ رک کر وہ پھر گویا ہوا ''ہمارا ماہر کاریگر بھی امید ہے تب اس خصوصی کام کے لیے فارغ ہو چکا ہوگا۔ وہ آجکل ملکہ کے سعودی عرب کے دورہ کے سلسلے میں تحفوں کی تیاری میں مصروف ہے۔ مَیں سمجھتا ہوں کہ مارچ سے قبل آپ کی چیز تیار نہ ہو پائے گی۔''
ٹھیک ہے میئر کے اگلے جشن سے پہلے ہی تیار ہو جائے گی۔ جیرالڈ نے سوچا کہ کونسلر ریمز بائم اس مرتبہ تمسخر نہیں اڑا سکے گا۔ اس نے چودہ قیراط سونے کا ذکر کیا تھا۔
جیرالڈ کے جوہری کے پاس پھر آنے سے قبل لاگوس اور ریوڈی جینرو کے سیورتیج مکمل ہو کر چالو بھی ہو چکے تھے۔ وہ میئر کی تقریب سے چند ہفتے قبل اپنی شے کو ایک نظر دیکھنا چاہتا تھا۔
جب مسٹر پولنگر نے پہلی بار اپنے گاہک کو اس کی تیار چیز دکھائی تو جیرالڈ کا منہ خوشگوار حیرت سے کھلے کا کھلا رہ گیا تمغہ اتنا شاندار تھا کہ جیرالڈ نے اپنی بیوی کا منہ بند رکھنے کے لیے سچے موتیوں کا ہار بھی خرید لیا۔
ہل شہر واپس پہنچ کر اس نے رات کے کھانے تک انتظار کیا جس کے بعد اس نے سبز رنگ کا لیدر باکس کھولا اور اپنی بیوی کو تمغہ دکھا کر حیرت زدہ کر دیا۔ ''کیوں لڑکی ہے نا ایک بادشاہ کے شایان شان؟'' لیکن اینجلا نے زیادہ توجہ نہ دی کیونکہ وہ اپنے موتیوں کے ہار میں منہمک تھی۔

اینجلا ہاتھ منہ دھونے لگی تو جیرالڈ قیمتی پتھروں کو کچھ دیر تک دیکھتا رہا جو اتنی مہارت سے کاٹے اور پالش کیے گئے تھے اور سلیقے سے جڑے گئے تھے۔ پھر اس نے لیدر بکس بند کر دیا۔ اگلی صبح وہ بادل ناخواستہ مہارت کے اس قیمتی نمونے کو لے کر بینک گیا اور اسے حفاظت کے ساتھ لاکر میں رکھنے کے بعد کہا اور انھیں بتایا کہ اسے سال میں ایکبار یا زیادہ سے زیادہ دوبارہ نکالنا پڑے گا۔ وہ خوشنما نمونہ بینک منیجر مسٹر پچلے کو دکھائے بغیر نہ رہ سکا۔

''آپ اسے میئر کی تقریب میں تو ضرور پہنیں گے'' منیجر نے دریافت کیا۔ ''اگر میں مدعو کیا گیا'' جیرالڈ بولا۔

''مجھے یقین ہے کہ مسٹر ریمز باٹم میئر بننے کے بعد اپنے تمام سابقہ دوستوں کو اور خصوصاً آپ کو ضرور مدعو کریں گے۔''

روزنامہ ٹائمز میں شاہی خبروں میں سے ایک خبر جیرالڈ نے پڑھ کر اپنی بیوی کو سنائی ''بکنگھم پیلیس سے اعلان کیا گیا ہے کہ ملیشیا کے شاہ الفانس چہارم سات اپریل سے گیارہ اپریل تک برطانیہ کا سرکاری دورہ کریں گے۔''

''ممکن ہے ہم شاہ کو ایکبار پھر مل سکیں گے'' اینجلا نے کہا۔

جیرالڈ نے کوئی رائے ظاہر نہ کی اور خاموش رہا۔

دراصل مسٹر اور مسز ہیسکنز کو شاہ الفانس کے سرکاری دورہ کے سلسلہ میں دو دعوت نامے موصول ہوئے تھے۔ ایک تو بادشاہ کے ہمراہ کیلرج میں کھانے کی دعوت تھی کیونکہ لندن میں ملیشیا کے سفارت خانہ میں ایسی تقریب منعقد کرنے کی گنجائش نہ تھی۔ دوسرا دعوت نامہ بکنگھم پیلیس سے خصوصی طور پر آیا تھا۔

جیرالڈ بہت خوش تھا۔ لگتا تھا پی کاک کو مہینے میں تین بار باہر آنے کا موقع ملے گا کیونکہ والٹر ریمز باٹم کے میئر کا عہدہ سنبھالنے سے دس روز قبل شاہی تقریب تھی۔

کیلرج کا سٹیٹ ڈنر ایک یادگار تقریب تھا۔ اگرچہ کئی سو دوسرے مہمان بھی تقریب میں آئے تھے لیکن جیرالڈ کو چند لمحے شاہ الفانس چہارم سے ملاقات کے لیے میسر آ گئے جو تقریب کا میزبان تھا۔ جیرالڈ اس بات پر بہت مسرور تھا کہ شاہ اس کے تمغے آرڈر آف دی پی کاک (تھرڈ کلاس) سے نظریں نہ ہٹا سکا تھا۔

ایک ہفتہ بعد بکنگھم پیلیس کی تقریب تھی۔ جیرالڈ اور اینجلا کا بکنگھم پیلیس جانے کا یہ دوسرا موقع تھا۔ پہلی بار وہ 1984 میں گئے تھے جب جیرالڈ کو CBE یعنی کمانڈر آف دی برٹش ایمپائر کا خطاب ملا تھا۔

دونوں میاں بیوی نے کافی وقت لے کر تیاری کا اہتمام کیا تھا اور تقریب کے لیے لباس پہنا تھا۔ جیرالڈ نے تھوڑا وقت کالر درست کرنے میں لگایا تاکہ CBE پوری طرح نظر آئے جبکہ آرڈر آف دی پی کاک (تھرڈ کلاس) اس کے کندھے پر آویزاں ہو۔ جیرالڈ نے اپنے درزی کو ٹیل کوٹ میں چھوٹے چھوٹے ٹوپ بنانے کے لیے کہا تھا تاکہ آرڈر آف دی پی کاک کو بار بار درست کرنے کی ضرورت نہ پڑے۔

جب میاں بیوی بکنگھم پیلس پہنچے تو تمغوں سے لدے مردوں اور زیورات سے آراستہ خواتین کے غول کے پیچھے چلتے ہوئے سٹیٹ ڈائننگ روم تک پہنچے جہاں وردی پوش ملازمین نے ہر مہمان کو نشست کے کارڈ پیش کیے۔ جیرالڈ نے کارڈ کھولا تو ایک تیر کا نشان اس کے نام کی طرف اشارہ کر رہا تھا۔ اس نے اپنی بیگم کا بازو پکڑا اور اپنی نشستوں پر لے گیا۔

اس نے نوٹ کیا کہ اینجلا ہر اس خاتون کی طرف دیکھتی تھی جس نے زرق برق لباس اور قیمتی زیورات پہن رکھے تھے۔ وہ ہر میجسٹی سے کچھ فاصلے پر یعنی بڑی میز کے ساتھ جڑی ہوئی میز پر بیٹھے تھے لیکن جیرالڈ کے بائیں طرف شاہی خاندان کا ایک فرد اور دائیں طرف وزیر زراعت تشریف رکھتے تھے۔ وہ بہت مطمئن تھا۔ دراصل ساری شام گزر گئی تھی اور جیرالڈ محسوس کر رہا تھا کہ میز بنانے والی ٹھسی رہے گی۔ پھر بھی جیرالڈ چشم تصور سے دیکھ رہا تھا کہ کونسلر ریمز باٹم آرڈر آف دی پی کاک (تھرڈ کلاس) کی توصیف کر رہا ہے اور وہ خود اسے محل والے ڈنر کی روداد سنا رہا ہے۔

دونوں طرف سے شاہی ٹوسٹ پیش کیے گئے اور دونوں ملکوں کے قومی ترانے بجائے گئے۔ اس کے بعد ملکہ نے اُٹھ کر تقریر کی۔ ملکہ نے میلیٹویا کے بارے میں اچھے جذبات کا اظہار کیا اور اپنے تین سو مہمانوں کو اپنے دور کے کزن شاہ الفانس چہارم کی بابت بتایا آخر میں ملکہ نے اُمید ظاہر کی کہ وہ مستقبل قریب میں شاہ کے ملک کا سرکاری دورہ کریں گی۔ اس پر خوب تالیاں بجائی گئیں پھر ملکہ نے دو تمغے دینے کا اعلان کیا۔

ملکہ نے شاہ الفانس کو KCVO یعنی نائٹ کمانڈر آف دی رائل وکٹورین آرڈر کا اعزاز دیا اور میلیٹویا کے سفیر کو CVO یعنی کمانڈر آف دی رائل وکٹورین آرڈر کا اعزاز دیا۔ یہ دونوں حکمران کے ذاتی تمغے تھے۔ درباری چیمبرلین نے رائل بلیو رنگ کا ایک بکس کھولا اور دونوں معزز مہمانوں کے کندھوں پر تمغے سجا دیے۔ جونہی ملکہ نے

اپنا رسمی فرض پورا کیا تو شاہ الفانس جوابی کارروائی کے لیے اُٹھا۔

رسمی الفاظ اور شکریہ ادا کرنے کے بعد شاہ بولا ''یور میجسٹی میں بھی دو ایوارڈ دینا چاہوں گا۔ پہلا ایوارڈ ایک ایسے انگریز باشندے کے لیے ہے جس نے اپنی علمی اور فنی مہارت کی وجہ سے میرے ملک کی عظیم خدمت سرانجام دی۔ شاہ نے اس مرحلہ پر جیرالڈ کی طرف دیکھا۔ وہ سلسلہ کلام جاری رکھتے ہوئے بولا ''اس شخص نے سینٹری انجینئرنگ کے شعبہ میں ایک معرکتہ الارا کام سرانجام دیا جس پر اس دنیا کی کوئی بھی قوم فخر کر سکتی ہے۔ اس سکیم کا افتتاح آپ ہی کے وزیر خارجہ کے ہاتھوں ہوا تھا۔ ہم صدر مقام ٹیسک میں نسلوں تک اس شخص کے ممنونِ احسان رہیں گے۔ لہٰذا ہم مسٹر جیرالڈ ہیسکنز C B E (کمانڈر آف دی برٹش ایمپائر) کو آرڈر آف دی پی کاک (سیکنڈ کلاس) مرحمت فرماتے ہیں۔''

جیرالڈ کو اپنے کانوں پر یقین نہ آ رہا تھا۔ زور شور سے تالیاں بجا کر خوشی کا اظہار کیا گیا۔ جب حیرت میں گم جیرالڈ اُٹھ کر دونوں حکمرانوں کی طرف روانہ ہوا وہ ملکہ برطانیہ اور شاہ ملٹیویا کی تخت نما کرسیوں کے درمیان کچھ فاصلے پر رُک گیا۔ شاہ نے آرڈر آف دی پی کاک (سیکنڈ کلاس) کے لیے حقدار کے ساتھ مسکراتے ہوئے ہاتھ ملایا لیکن نیا تمغہ عنایت کرنے سے قبل شاہ نے آرڈر آف دی پی کاک (تھرڈ کلاس) کافی جدوجہد کر کے جیرالڈ کے کندھے سے اتار لیا۔ ''اب آپ کو اس کی ضرورت نہیں رہے گی'' شاہ نے جیرالڈ کے کان میں آہستہ سے کہا۔

جیرالڈ خوفزدہ ہو کر اپنے قیمتی اثاثہ کو دیکھتا رہا جو ایک سرخ رنگ کے لیدر بکس میں غائب ہو گیا جس کا ڈھکنا شاہ کا پرائیویٹ سیکرٹری کھولے قریب ہی کھڑا تھا۔ جیرالڈ پرائیویٹ سیکرٹری کی جانب دیر تک دیکھتا رہا جو یا تو اعلیٰ درجہ کا ڈپلومیٹ تھا یا اسے شاہ کے منصوبے کا بالکل علم نہیں تھا کیونکہ اس کے چہرے پر کوئی غیر معمولی تاثر نہ تھا۔ جب جیرالڈ کا شاندار قیمتی انعام اتار دیا گیا تو بکس ایک ایسے سیف کی مانند ہو گیا جس کو کھولنے کا طریقہ جیرالڈ کو نہ بتایا گیا ہو۔

جیرالڈ احتجاج کرنا چاہتا تھا مگر اس میں قوت گویائی نہ تھی۔ شاہ نے پھر ایک اور بکس سے آرڈر آف دی پی کاک (سیکنڈ کلاس نکالا اور جیرالڈ کے کندھوں پر ڈال دیا۔ جیرالڈ نے شیشے کے نامانوس پتھروں کو دیکھ کر ایک لمحے کے لیے ہچکچاہٹ محسوس کی اور پھر لڑکھڑاتے ہوئے ایک قدم پیچھے ہٹ کر تعظیم میں جھکا اور

بڑے کھانے کے کمرے میں اپنی نشست پر واپس آ گیا۔ وہ اپنے پیچھے آنے والی تالیوں کی گونج کو نہ سن سکا۔ اس کا ذہن یہ سوچنے میں منہمک تھا کہ تقریروں کے ختم ہونے کے فوراً بعد وہ کس طرح اپنا قیمت اثاثہ واپس حاصل کر سکے گا۔

''اور اب'' شاہ نے تقریر جاری رکھتے ہوئے کہا ''ایک ایسے تمغے کا اعلان کروں گا جو میرے والد کی وفات کے بعد سے آج تک کسی کو نہیں دیا گیا۔ میں انتہائی مسرت کے ساتھ آرڈر آف دی پی کاک (فرسٹ کلاس) ہر میجسٹی ملکہ الزبتھ دوم کو عطا کرتا ہوں۔''

ملکہ اپنی نشست سے اُٹھی اور شاہ کا پرائیویٹ سیکرٹری ایک بار پھر آگے بڑھا۔ اس کے ہاتھ میں وہی سرخ لیدر بکس تھا جس میں جیرالڈ کا قیمتی اثاثہ بند کیا گیا تھا۔ لیدر بکس کھولا گیا اور شاہ نے شاندار تمغہ اُٹھا کر ملکہ کے کندھوں پر سجا دیا۔ موم بتی کی روشنی میں اصلی اور قیمتی ہیرے اور جواہرات چمک رہے تھے۔ حاضرین محض اس کی چمک دیکھ کر حیرت میں گم تھے۔

اس بڑے کمرے میں جیرالڈ واحد شخص تھا جسے اس کی اصلی قیمت کا علم تھا۔

''دیکھو تم ہمیشہ کہتے تھے کہ یہ کسی حکمران کے شایان شان تھا'' اس کی بیوی نے اپنے موتیوں کی مالا کو چھوتے ہوئے کہا۔

''ہاں'' جیرالڈ نے کہا ''لیکن اسے دیکھ کر ریمز باٹم کیا کہے گا۔'' اس نے آرڈر آف دی پی کاک (سیکنڈ کلاس) کو انگلی سے چھوتے ہوئے کہا۔ ''وہ جان جائے گا یہ اصلی شے نہیں ہے۔''

''میری دانست میں یہ اتنی اہم بات نہیں'' انجلا نے کہا۔

''لڑکی تم کیا کہنا چاہتی ہو؟'' جیرالڈ نے دریافت کیا ''میئر بنانے کے موقع پر میں اہل شہر میں سب کے لیے مذاق بن جاؤں گا تمھیں شام کے اخبار کا مطالعہ کرنا چاہیے جیرالڈ اور شیشے میں بار بار دیکھنا بند کرنا چاہیے۔ تب تمھیں معلوم ہوگا اس برس والٹر میئر نہیں بن رہا۔''

''میئر نہیں بن رہا؟ جیرالڈ نے الفاظ دہرائے۔

''نہیں! موجودہ میئر نے دوسرے برس بھی کام کرنے کا فیصلہ کیا ہے۔''

''کیا یہ درست ہے؟'' جیرالڈ نے مسکراتے ہوئے کہا۔

''اور جیرالڈ ہیکنز اگر تم وہ سوچ رہے ہو جو میں سمجھتی ہوں کہ تم سوچ رہے ہو تو اس مرتبہ تمھیں میرے لیے جڑاؤ زیورات بنانے ہوں گے۔''

☆☆☆☆☆

''دھنی''

بہت غریب ہونے کے ساتھ ساتھ وہ گہری سانولی بھی تھی، چپٹی ناک اور چھوٹی چھوٹی آنکھوں کو جوانی بھی خوبصورت نہ کر سکی تھی۔ ایسے میں اس کے رشتے ڈھونڈ کا اعصاب شکن مرحلہ کتنے سالوں سے اسکے ماں باپ کی کمر توڑتا آ رہا تھا کہ ایک روز ایک قدرے شریف لڑکے کا رشتہ آیا اور وہ بھی ایسے کہ بس ''رانو'' کو ہماری بہو بنا ہی دو، تو گہری سانولی رانو، کے والدین شکر بجا لاتے نہ تھکتے۔

رانو آن کی آن میں ان کے گھر کی زینت بن گئی، لڑکا شریف تھا لہٰذا وہ اپنے ماں باپ کا کہا مکمل طور پہ مانتا، ماں کہتی کہ رانو کو کام پہ لگاؤ لڑکا اسے کام پہ لگا دیتا ماں کہتی رانو نے کام نہیں کیا اسے سبق سکھاؤ تو یہ سعادت مندی کے ساتھ رانو کی ہڈی پسلی ایک کر دیتا، رانو غربت کا منہ دیکھتی اپنا منہ تھپڑوں سے کالا کرواتی رہی اوپر سے بے اولادی سفاک عفریت بنی اس کے مقدر سے چپکی ہوئی تھی جو کسی دم درود سے جان چھوڑنے پہ راضی نہ تھی۔ ایک روز سعادت مند نے ماں کے کہنے پہ رانو کو اولاد کی خوشخبری سنانے کا ایک مہینہ بتا دیا اور پھر عین اس مہینے کے بعد طلاق کا بھی فیصلہ سُنا دیا۔

وہ طلاق کی گٹھری میں بندھے کئی لمحے بھی باندھ لائی جن میں وہ سعادتمند کے لیے روٹی پکاتی اور شکر گھی میں گوٹ کے چُوری ڈالتی کہ میاں کی صحت اچھی رہے، کئی بار اس کے کپڑے اپنے ہاتھوں سے محض اس لیے دھوئے کہ دوپہر میں وہ دھوپ میں تار پہ دھلے کپڑے ڈال کے اس کو محسوس کرنے کا لطف لے، وہ کاجل لالی پراندے میں گندھے یہ لمحے بھی اُٹھا کے میکے آ گئی----

ماں باپ نے پھر سے رانو کو دیکھتے ہوئے اپنی زندگی کی سمت مقرر کی کہ اب کے رانو، رانو نہیں بنجر مطلقہ تھی۔ سو رشتے مخصوص لوگوں کے آنے لگے، انہی میں سے ایک دکاندار نے اس کا ہاتھ اس لیے مانگا کہ وہ اس کی اولاد کی دیکھ بھال دل و جان سے

بشریٰ شیریں

کرے گی اور یہ کہ اسکی مزید بچوں سے جھنجھٹ نہ پڑنے کا پرمٹ اسی کے پاس تھا۔ رانو پھر سے دُلہن بنی دکاندار کے گھر آ گئی، خوشحالی راس آئی تو رانو کی سانولی رنگت میں لالی آنے لگی، ہنسنے مسکرانے لگی' سارا دن کام کاج کرتی نہ تھکتی، بچوں کے ٹفن سکول لنچ سب تیار، گھر بھی خوشی سے صاف کرتی گویا آرام کا وہ جہان آباد اور میسر تھا کہ پچھلا سسرال اب اس کو کبھی یاد بھی آیا تو گرد کی ایک سیاہ سی لکیر کی مانند جسے وہ صاف کرنے پہ اب قدرت رکھتی تھی۔ ایسے ہی چمک دمک اور مہک بھرے دنوں میں اس کو ایک نرس نے اولاد کی خوشخبری سُنائی اور پھر رانو نے رات کو دکاندار کو سنائی۔ وہ کھانا کھانے کے دوران پہلی بار رانو سے اصول پہ بات کرنے کا لہجہ اپناتے ہوئے بولا دیکھ یہ معاہدہ تھا کہ تو بچے پیدا نہیں کرے گی اور میں تجھے لایا بھی اسی لیے کہ تو بانجھ تھی اب یہ سب کیا ہے ---- رانو کو اسکی بات کم سُنائی دی تھی کہ جب وہ وعدہ یاد دلا رہا تھا تو ایک کلکاری نے اسکو اپنی جانب متوجہ کر لیا تھا، رانو بولی کہ بس یہ ایک۔ اس کے بعد نہیں۔ اللہ نے مجھ پہ رحم کیا ہے میں خود اپنی محنت کی کمائی سے پال لوں گی، تجھ سے ایک روپیا نہ لوں گی بس مجھے اس کو پیدا کرنے دو ----

میاں نے اس کی کمائی کو حقارت سے سنتے ہوئے کہا کہ کل شام کو مجھے سوچ کے بتانا کہ تمھارا فیصلہ کیا ہے، رانو نہ ہکا بکا تھی نہ وہ ڈر رہی تھی نہ اسکو آنے والا وقت دکھائی دے رہا تھا اس نے جی اچھا کہا، برتن اُٹھائے دھوئے اور پھر آ کے سو گئی، اگلی شام تک وہ اپنے ماں باپ کو نانا نانی بننے کی خوشی سُنا چکی تھی، نانی نے مٹھائی کا ڈبہ بھی بھیج دیا محلے کے لڑکے کے ہاتھ اور کہا کہ ہم اگلے ہفتے آئیں گے--

شام کو دکاندار جب گھر آیا تو رانو نے کھانا کھانے کے بعد خوشی خوشی مٹھائی اسکو دی اور دکاندار نے مٹھائی اُٹھا کے دیوار پہ دے ماری اور اس کو گھر سے نکال دیا-- دھتکاری ہوئی بے یقین سی رانو کو اب کل شام والے الفاظ سُنائی دیئے اور رات کی تاریکی دکھائی دی جب اسے دکاندار نے گھر سے نکال کے دروازہ بند کر دیا تھا-- وہ اب کے ایک کلکاری ساتھ لیے ماں باپ کا دروازہ کھٹکھٹانے اور نہ کھٹکھٹانے کی شش و پنج میں انکی دہلیز پہ کھڑی رہی ----

☆☆☆☆☆

جنھیں راستے میں خبر ہوئی

وہ بہت خوش تھی - اس کی خوشی کی کئی وجوہات تھیں اور ہر وجہ اس کی خوشی کے ساتھ اس کے لیے تفاخر کا باعث بھی تھی۔

تمام وجوہات میں سب سے معتبر وجہ وہ پَر تھے جنھیں استعمال کرنے کی اسے اجازت دی گئی تھی۔ ورنہ آج سے پہلے وہ ان پروں کو لباس کی بندشوں میں چھپاتی ان کے بے مصرف وجود پہ شرمندہ نظر آتی تھی۔

اس کی خوشی کی دوسری وجہ وہ آسمان تھا جو خاص اس کی پرواز کے لیے مختص کیا گیا تھا۔ تاحدِ نظر پھیلا نیلا آسمان جو آج سے پہلے گمان کی دسترس سے بھی دور دکھتا تھا آج اس کا لمس اس کے پروں میں مہک رہا تھا گویا یہ پر اور آسمان کسی اور جہان میں دو جسم ایک جاں ہوا کرتے تھے۔۔

لیکن۔۔۔ پھر یوں ہوا کہ ابھی وہ ڈھنگ سے اڑان بھرنے کا سوچ بھی نہ پائی تھی کہ اس کی اڑان کی منظوری کے لیے درخواست ایک نئے دفتر میں بھجوا دی گئی۔ اور وہ مہندی لگے ہاتھوں میں اپنی قسمت کی لکیریں ٹٹولتی رہ گئی۔ اسے سمجھوتے کی گھٹی پلا کر ایک نیا آشیانہ بسانے کو رخصت کر دیا گیا۔ ایسے میں سب سے بڑا نقصان یہ ہوا کہ اسے اپنے پروں کو پھر سے چھپانا پڑا لیکن وہ پر جو پرواز کی امید کا ذائقہ چکھ چکے تھے اب کسی طور بندشوں کو ماننے پر آمادہ نظر نہ آتے تھے۔ لیکن اس سے کیا فرق پڑتا تھا۔ وہ جانتی تھی کہ دھیرے دھیرے ہی سہی ان پروں میں ہمکتی پھڑپھڑاہٹ کی آرزو اپنی موت آپ مر جائے گی۔۔ تب راوی چین ہی چین لکھے گا۔

اس آگہی کا فائدہ یہ ہوا کہ وہ سب کچھ بھول کر ایک نئی دنیا بسانے میں مگن ہو گئی۔۔ ”سب کچھ“ میں اس کا اپنا وجود بھی شامل تھا۔

وہ اینٹ پتھر سے بنے در و دیوار کو گھر بنانے کی کوششوں میں گم تھی کہ اسے اپنے پروں کو سہلاتے کسی محرم لمس کا ادراک ہوا۔ وہ بدک کر پیچھے ہٹی تو اس واردات کا ماخذ جان کر سہم گئی۔

”کہیں انھیں میرے پروں کی موجودگی کا علم تو نہیں ہو گیا“

”اب میں کیا کروں گی؟“

”میں اپنے وجود کی اس حقیقت کو تسلیم بھی کر پاؤں گی یا نہیں؟“

”کہیں میرا آشیانہ بکھر تو نہ جائے گا؟“

کنزیٰ خالق

بہت سے سوالیہ نشان دن میں تاروں کی مانند اس کے سر پر منڈلانے لگے۔

''ارے تم نے مجھے پہلے کیوں نہیں بتایا کہ تم اڑ سکتی ہو؟'' سب سے پہلا جملہ جو مقابل کے ہونٹوں سے برآمد ہوا وہ اس کے لئے غیر متوقع تھا۔

''جی؟؟؟؟'' اس نے خوف آمیز حیرت سے سوال کیا۔

''پر تو پرواز کے لئے ہوتے ہیں نا!!! اور تمھارے پر تو آسمان چھونے کی قدرت رکھتے ہیں'' ان لفظوں کی بو پاتے ہی اس کے پر تمام بندشیں توڑتے پھڑ پھڑانے لگے۔

''پر تو میرے پاس بھی ہیں لیکن انہیں کبھی اعتبار کا مان ہی نہیں بخشا گیا کہ میں اس کمرے کی حد سے باہر اڑ پاتا۔ لیکن میں چاہتا ہوں تم اڑو..... بے خوف ہو کر'' یہ لفظ گویا آب حیات تھے۔۔

''اگر میں گر گئی تو؟'' وہ ہر طرح سے تسلی کرنا چاہتی تھی۔

''تو پگلی میں ہوں نا سنبھالنے کے لئے'' اس کے مجازی خدا نے اس کے حوصلوں کو پیار سے تھپکا۔۔

اور وہ ایک بار پھر کسی معصوم بچے کی مانند پرواز کے لیے پر تولنے لگی۔ آسمان اور بھی خوبصورت دکھنے لگا۔ پروں میں اعتماد دہکنے لگا۔۔

یوں مختصر سے عرصے میں وہ پرواز کے لیے تیار تھی۔ لیکن اس سب کے درمیاں کہیں کچھ غلط ہونے کا احساس اسے مسلسل کچوکے لگاتا تھا۔ وہ اس احساس کو اپنا وہم جان کر بے فکری کی ردی کی ٹوکری کی نذر کرنے لگی کہ اس کے سوا کوئی چارہ بھی تو نہ تھا۔

''کہیں کچھ بھی تو غلط نہیں ہے''

''سب اچھا ہے''

''مجھے میرے پروں کو استعمال کرنے کی اجازت مل گئی اب اور کیا چاہئے مجھے''

''اب کوئی میری پرواز نہیں روک سکتا''

''میں اڑوں گی اور صرف اپنے لیے نہیں ان کے لیے بھی جنہیں اڑنے کو آسمان نہ ملا..... یا جن کے پر اپنے حصے کا آسمان کھوج ہی نہ پائے''

وہ تنکا تنکا حوصلے چنتی آگے بڑھتی گئی۔ پرواز کے لیے خود کو تیار کرتی جب کبھی اپنے وہ پر پھڑ پھڑاتی۔۔ اسے لوہے کی زنجیروں کی جھنکار سنائی دیتی۔ وہ اس جھنکار کو اپنے پروں کی مداح سمجھتی آگے بڑھتی رہی۔ اور زمین ختم ہو گئی۔

زمین ختم ہوئی اور اس زمین کی آخری حد پر کھڑی خوف اور بے خوفی کے جذبات سے مغلوب اڑان کے لیے حوصلے اکٹھے کرنے لگے۔ اس سے آگے آسمان ایک واحد ''آپشن'' تھی۔۔ زمین یا آسمان کی کشمکش ختم ہونے کو تھی۔

لیکن یہ کیا؟؟

اس نے اڑنے کو پر تولے تو پروں کی پھڑ پھڑاہٹ سے زیادہ شور جھنکار کا تھا۔ اس نے حیرت سے مڑ کر دیکھا تو دونوں پروں سے منسلک مضبوط آہنی زنجیروں کا دوسرا سرا اسے ان ہاتھوں میں دِکھا جس کا لمس جستجو کے اس سفر میں اس کا سب قابلِ اعتماد زادِ راہ تھا۔۔

☆☆☆☆☆

ایک معلم طالب علم کو کیا دے سکتا ہے

والدین کے بعد ایک بچے کی تربیت میں سب سے زیادہ اہم کردار معلم کا ہوتا ہے فی الوقت ہمارے معاشرے میں معلم کی ذمہ داری محض بچوں کے ذہنوں میں معلومات انڈیلنے کے عمل کو سمجھا جاتا ہے، قطع نظر اس کے کہ وہ نرمی سے ہو یا سختی سے۔ پھر چاہے اس عمل کے لیے بچے کی کتنی امکانی صلاحیتوں (Potentials) کو دفن کرنا پڑ جائے۔ والدین اور اساتذہ کا مرتبہ بلند ہونے کی بنیادی وجہ یہی ہے کہ ان پر ذمہ داری بھی اتنی ہی بڑی ہے۔ اگر میں خود پر عائد ذمہ داری کا بوجھ اٹھانے کے لیے تیار نہیں ہوں تو میں اس تکریم کی مستحق بھی نہیں جو مجھے مل رہی ہے۔ یہی اصول فطرت ہے کہ جتنا بڑا مرتبہ اتنی ہی بڑی ذمہ داری۔

اس حوالے سے ایک معلم کی ذمہ داری قابل غور ہے۔

کسی بھی بچے کی زندگی میں والدین کے بعد سب سے زیادہ اہمیت استاد کی ہے۔ استاد معاشرے کو بناتے ہیں، سنوارتے ہیں نیز بگڑے ہوئے معاشرے میں سب سے زیادہ متفق بگاڑ اگر ڈھونڈا جائے تو وہ بگڑا ہوا نظام تعلیم ہے۔ جس معاشرے میں معلم کی ذمہ داری اور اس سے منسلک توقعات صرف اتنی ہوں کہ وہ طالب علم کو اس قابل بنا دے کہ وہ فقط امکانی معاشی سرگرمیوں سے نمٹ سکے، وہاں معاشرے سے علمی، اخلاقی و تہذیبی بلندی کی امید رکھنا حماقت ہے۔

تو آخر ایک معلم کی اصل ذمہ داری کیا ہے؟

ایک استاد بچے کو کیا دے سکتا ہے؟

نظام تعلیم اگر ایک جسم ہے تو وہ معلم اس جسم میں ریڑھ کی ہڈی کی حیثیت رکھتا ہے جو ہر وقت سیکھنے کی جستجو رکھتا ہے۔ علم کی طلب رکھنے والا معلم طالب علم کو علم کا محب بنا دیتا ہے۔ خود کو غیر اہم محسوس کرنے والے بچے کو ایک آئیڈیل معلم اہم ہونے کا احساس دلاتا ہے۔ گھریلو یا معاشرتی بے جا سختیوں کا متحمل وہ بچہ جو اپنے ہر عمل پر خائف رہتا ہے۔ معلم اسے احساس تحفظ فراہم کرتا ہے۔ تربیت میں کمی رہ جانے والے بچوں کی شخصیت کی تکمیل ایک معلم کرتا ہے۔ وہ بچہ جو مہمانوں کے سامنے آنے سے گھبراتا ہے ایک معلم اسے سوشل جینیئس بنا سکتا ہے۔

معلم سوچنا سکھاتا ہے طالب علم کے اندر Reasoning پیدا کرتا ہے وہ طالب علم کو سناتا ہے اسے سمجھانے سے زیادہ سمجھنے کی کوشش کرتا ہے۔ وہ چھوٹے چھوٹے مسائل جو بچے کے لیے پہاڑ جیسے ہیں انھیں نہ صرف حل کر کے دیتا ہے بلکہ حل کرنا سکھاتا ہے۔ وہ بچے کو محض پڑھاتا نہیں اس میں پڑھنے کا شوق پیدا کرتا ہے۔ وہ بچے سے زبردستی لکھواتا نہیں اسے خوشی سے لکھنے پر آمادہ کرتا ہے۔ اسی طرح وہ بچے کو کنٹرول کرنے کی کوشش نہیں کرتا بلکہ اسے سیلف کنٹرول سکھاتا ہے (جو ایک مشکل عمل ہے)

معلم بچے کو لالچ یا خوف دے کر اس سے کام نہیں لیتا بلکہ اپنی گفتگو، کہانیوں اور مضبوط تعلق سے بچے کے لیے اپنی توقعات اہم بناتا ہے۔ (جس کے نتیجے میں حکم ماننے کا عمل بچے کے لیے خوشی کا باعث بنتا ہے۔) وہ بچے کی خواہشات کو پورا نہیں کرتا بلکہ وہ اسے اپنی ضروریات کو پہچاننا سکھاتا ہے۔

ایک معلم بچے کو اسٹریس دینے کے بجائے اسے صحت بخش ٹاسک دیتا ہے اور ان چیلنجز کو حل کرنا سکھاتا ہے۔ معلم بچے کی عزت نفس کی حفاظت کرتا ہے اس کی تکریم کے ذریعے وہ اس میں مکرم ہونے کا احساس پیدا کرتا ہے۔

معلم بچے کو اول نمبر آنا نہیں سکھاتا بلکہ ہر وقت سیکھنے کی جستجو، کوشش اور نتیجے کو قبول کرنا سکھاتا ہے۔ پھر چاہے وہ نتیجہ امتحان کا ہو یا زندگی کے کسی اور امتحان کا۔

ایک آئیڈیل معلم کو دیکھ کر بچے خوف سے راستہ نہیں بدلتے بلکہ زیادہ سے زیادہ وقت قریب رہنے کی چاہت رکھتے ہیں۔

☆☆☆☆☆

محمد اویس

کمزور ''کلامیے'' کی موت

مرے ڈھاکہ
ہمارے ربط کی تاریخ میں رخنہ پڑا تو
اُس طرف بگلیں بجائیں دشمنوں نے
اور اِدھر کچھ اپنے ناداں دوست بھی بولے
''نشیمن ٹوٹ جانے کی
''کلامی'' پیشگوئی
آج پوری ہو گئی دیکھو!''
کسی نے یہ نہ سوچا
جسم و جاں کے فاصلوں سے
روح کے رشتے نہیں مرتے
کسی طوفاں،
کسی عنوان
سچے صاحبِ ایقان
اپنا مسترد ماضی
کبھی زندہ نہیں کرتے
یہ مت بھولیں!
''کلامی'' کا تو کہنا تھا
بناؤ مت علیحدہ آشیانہ
بن کے رہ جاؤ گے افسانہ
اور اپنا فیصلہ تھا
اپنی نسلوں نے
کھلی تحقیر کے نرغے میں
گھٹ گھٹ کر نہیں جیون بتانا
سو ہمیں درکار ہے
اپنی زمیں، اپنا زمانہ
اے مرے ڈھاکہ
ترے قرباں
تری مشکل رُتوں
جو اپنی کینہ پروری میں
تیرا محسن بن کے آیا
تو نے اس کو یہ بتایا
دور ہم سے ہو کے بھی
تجھ کو
جہنم زار کا ایندھن نہیں بننا
گل و گلزار ہی رہنا ہے
ویراں بن نہیں بننا
عدو کیا کیا جتن کرتا رہا
لیکن نہ تو
اُس کی کسی بھی چال میں آیا
نہ اُس کے ہم لسانی جال میں آیا
یہ نکتہ تو نے دنیا بھر کو سمجھایا
کبھی ہم خانہ ہو سکتا نہیں
بدخواہ ہمسایہ
کہ ''را'' سے نہیں تیرا کوئی ناطہ
کہ تو اب بھی ہمارا اُمتی بھائی،
ہلالی بنگلہ تہذیبی اکائی ہے
ہمارے ساتھ سو خفگی ہو
پر اُس سے تری پکی لڑائی ہے

جلیل عالی

معراجِ محسن [محسن شیخ کے لیے]

مرے محسن
تھا کیسا دن!
مجھے سیل فون پر
یہ صالحہ بیٹی نے بتلایا
"ذرا آرام کرنے کے لیے لیٹے تھے
شاید سو گئے ابّو
ابھی اٹھتے ہیں تو
میں بات کرواتی ہوں انکل!"

میرے پیارے یارِ دیرینہ
میں تیرے نیند سے بیدار ہونے کا
ابھی تک منتظر ہوں
تجھ کو
اک تازہ غزل میں نے سنانی تھی
اور اس پر دیر تک سننا تھا تیرا
دل بڑھاتا تبصرہ
اور تبصرے پر داد دینی تھی
تری اشعار فہمی کی

مجھے جس نعت کے
دو شعر کل تو نے سنائے تھے
مکمل مجھ کو سننی تھی

مجھے لگتا ہے
جیسی نعت کہہ جانے کی حسرت
عمر بھر تو اپنے سینے میں
لیے پھرتا تھا
ویسی ہو گئی ہو گی
اور اس خوشیوں لدے لمحے
ضرور ایسا ہوا ہو گا
وفور ایسا ہوا ہو گا
کسی کے تھامنے سے بھی
کہاں تھمتا
کہ تیرا دا لہانہ پن
سرِ کہسار جا پہنچا
کہ تو اپنا یہ نذرانہ لیے
بے اختیارانہ
حضورِ سرورِ کونین کے
دربار جا پہنچا

جلیل عالی

بیوگی

تم کہتے تھے
میری چندا!
گھر سے باہر قدم نہ رکھنا
گھر جنّت ہے
باہر نکلو گی تو میلی ہو جاؤ گی
باہر کیچڑ ہی کیچڑ ہے
لوگوں کی نیلی، پیلی آنکھوں،
سِفلی جذبوں،
مُتفنّن سوچوں،
زہریلی باتوں کا کیچڑ
شبنم سی پوشاک
گلابی جسم
طلائی روح کو کیچڑ کر دینے والا کیچڑ

تم کہتے تھے
یہ بیڈ روم مرا گلشن ہے
جس میں تمھارے جسم،
تمھارے ہونٹوں، رُخساروں، زلفوں،
سانسوں کی بھینی بھینی مہک بسی ہے

تم کہتے تھے
یہ چہرہ، میرا چہرہ ہے
میری ہی آنکھوں کے لیے ہے
اِسے مِری آنکھوں سے کبھی اوجھل نہیں کرنا

تم کہتے تھے
ہم دونوں بھی لکے کبوتر کی جڑی ہیں
عشق کے لَے پر بے خود ہو کر
ناچتے، گاتے، مَن پَر چاتے، ناز اُٹھاتے
ہوا میں پلٹیاں کھاتے، موج اُڑاتے

جانم!
کہاں گئے تم!
کِدھر گئیں وہ اَمرت رَس باتیں،
وہ نیندیں، خواب اور راحتیں،
گُزری ساعتیں

تم کیا جانو؟
کتنا جاں لیوا ہے
رات کو دن،
اور دن کو رات کیے جانا
مِلتے رہنا
پل پل تم سے بات کیے جانا
جُرعہ جُرعہ زہر کا ساغر پینا
تنہا رہنا
تم بن جینا

محمد انیس انصاری

شریکِ عمر کے نام اِک چٹھی

سدرشن، جوہی، بیلا، موگرا، چمپا
کدم، چنبیلی، شب بو، موتیا، گیندا
یہ باغوں اور رستوں میں نہیں کھلتے
تمہاری کم سنی کے کھلتے خال و خد میں کھلتے ہیں
صبا کے نرم رو جھونکے
تمہاری کچی عمروں کی مہکتی سانس بھرتے ہیں
تو یہ لہرا کے چلتے ہیں
چراغوں نے، ستاروں نے تمہاری آنکھیں دیکھی ہیں
نہیں تو جھلملانے کا، چمکنے کا ہنر معدوم ہو جاتا
جھکے دروازے کی چوکی پہ بیٹھا شام کا منظر
تمہاری پلکیں جھکتی ہیں تو گہرا ہوتا جاتا ہے
مری صبحوں کا دروازہ
تمہاری مسکراہٹ کا دریچہ کھلنے پر ہی کھلتا ہے
ہواؤں نے تمہارے گیسوؤں سے جھومنا سیکھا
شبِ تاریک میں جگنو پتا ہے کیوں چمکتے ہیں
تمہیں ان کا چمکنا اچھا لگتا ہے
میں کیا کیا سوچا کرتا تھا
مری تقویم کا ہر دن
تمہارے ساتھ جینے کی تمنا میں نکلتا تھا
میں خوابوں میں تمہارے ساتھ میلوں دور چلتا تھا
کسی گل ریز رستے پر
شریکِ عمر !
لکھا ہے تمہارا نام اب تک یادکی ادھڑی کتابوں میں
سسکتے خواب کے بے رنگ بستے پر

طالب انصاری

اشجار کی حکومت

یہ اشجار قدرت کی کیسی عطا ہیں
کہ خود دھوپ میں گرچہ جلتے ہیں رہتے
مگر دوسروں کو ہیں بس سایہ دیتے
نئے پھول جس دم یہ اپنے نکالیں
فضاؤں کو مہکار ہی سے نوازیں
جوانی کے ایامِ زریں میں اکثر
چہکتے مہکتے سے شیریں پھلوں سے
دہن کو ہمارے یہ گلزار کر دیں
بنا ذات پوچھے پرندوں کو ہر دم
خوشی سے محبت کی آغوش دے دیں
اور اپنے گھرانے کا اک فرد سمجھیں
یہ اشجار ہی ہیں جو ساری زمیں پر
ترے میرے جینے کا سامان کر دیں
ہمارے تنفس کو آسان کر دیں
کسی طرح آخر یہ گر سوکھ جائیں
تو لکڑی ہمارے لیے چھوڑ جائیں
عجب مقصدِ زیست اشجار کا ہے
سراپا ہیں خدمت سراپا محبت
دریں حال ثاقب یہی معتبر ہے
کہ حلِ مسائل کی خاطر "حکومت"
لہکتے درختوں کو ہم دان کر دیں

منظور ثاقب

خامشی کے سبز پس منظر میں (جناب خالد علیم کے لیے)

گلِ اظہارِ جاں
تم جانتے ہی ہو
کہ میں نے خامشی کے
سبز پس منظر میں بھی
اِک عُمر خاموشی سُنی ہے
پیش منظر کے سُلگتے شور کے اُس پار
جذبے بولتی آنکھیں
محدّب حیرتوں کے عکس بُنتی سوچتی آنکھیں
حدودِ عرصۂ ہجر و توصّل سے ورا
تہذیب سے الفاظ کا
اور خیر سے اخلاص کا رشتہ مجسم نظم لگتا ہے
کتب خانے کی الماری میں روشن
اک کلاسیکی مجلّہ
مسکراتی دوستی
اک میز کے کونے سے کونے تک
مجلّد خواہشوں کی سرسراہٹ
دھیرے دھیرے خواب بن کر پھیلتی جاتی ہے
کس ہموار جگراتے کے مسطر پر
فغانِ دل کی لے پر، وہ
دمکتی انگلیوں میں رقص کرتے ادھ جلے سگریٹ کا سرکش دھواں
اور چائے کے پیالے سے اٹھتی بھاپ
مصرعوں کی طرح موزوں بھی ہوتے ہیں
کبھی دیکھا نہیں تھا
اور اُدھر کھڑکی سے باہر
اشک آور دوپہری
آتے جاتے موسموں کے ایسے گوشوں سے بھی گزری ہے

یہ نیلے آسماں کو یاد تو ہوگا
جہاں بس چھاؤں تھی، سایہ نہیں تھا
چار سُو، دیوار و در دیوار اندیشے لپکتے تھے
بظاہر حرفِ تسکیں کی طرف کھلتا دریچہ،
کوئی دروازہ نہیں تھا
ایسے قصبے، ایسے قصّے میں
امیدیں لکھنے والی
حوصلے تعمیر کرتی
بے غرض وہ خامشی میں نے سُنی ہے
میں نے دیکھی ہیں
غنودہ بے حسی سے منحرف وہ جاگتی آنکھیں
جو مُردہ آنکھ میں بھی زندہ چہرہ دیکھ لیتی ہیں
محدّب حیرتوں کے عکس بُنتی سوچتی آنکھیں
وہ جذبے بولتی آنکھیں
دعا کے دونوں پلڑوں میں ستارے تولتی آنکھیں
اُفق کے حاشیے پر
مرتعش خط میں
دھڑکتی چیخ لکھتی جا رہی ہیں
جانے والی رُت کی اک نم ناک
قدرے ملگجی تختی پہ اُجلی
آنے والی صبح کی تاریخ لکھتی جا رہی ہیں

حامد یزدانی

بے چارگی

دخانی چشم

اشکوں سے حرارت چُن رہی ہے

مگر اس تاؤ پہ

روٹی نہیں پکتی

جو شیرِ مادری بن کر

کسی طفلِ حزیں کی

ضعف میں ڈوبی

رگوں میں جان ڈالے

اور شارعِ زندگی پر گامزن کر دے

علی اصغر عباس

------------ انتخاب ------------

— خالد احمد —

-------- نعمان منظور --------

کتنے درد چمک اٹھے ہیں
دل نے سورج کو شرمایا

بھاگ بھری ترے بھاگ

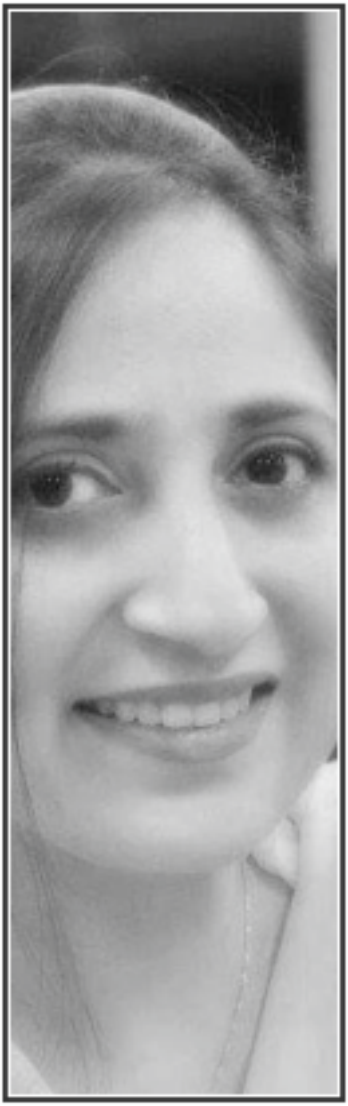

عنبرین صلاح الدین

بھاگ بھری، ترے ہاتھ کٹورا مٹی کا انمول
بھید بھری، ترے اندر دھڑکے دھرتی کا ہر بول
ہری بھری، ترا لمس بڑھاتا ہے کھلیان کا تول

تیرے پاؤں کی چاپ کا بھیدی ہر کھلیان، منڈیر
دل کی زمیں میں کسی نئے اِمکان کے ہل کو پھیر
پھر ترتیب سے پگڈنڈی پر رکھ خوشیوں کے ڈھیر

اُگتے سورج کی رنگت کے جیسا تیرا روپ
تیرے روپ کے جیسی تیرے کھیت میں کھلتی دھوپ
تیرے ہاتھ کے لمس سے ہر کیاری کا الگ سروپ

لیکن تیرے خواب کے کھیتوں میں ہے سیم اور تھور
تیری خواہش کے پیڑوں میں بس دیمک کا زور
سرسر کرتا شوق کی بیلوں میں پت جھڑ کا شور

دھرتی اور ہاری عورت کی کیا مرضی دھن پر
سبھی خراشیں اک جیسی ہیں دونوں کے تن پر
لیکن کچھ ایسی ہیں جو ہیں صرف ترے من پر!

انوار کی بارش (نعتیہ نظم)

اندھیرا ہی اندھیرا تھا جہاں میں

جہالت معصیت کا ہر طرف اندھیر پھیلا تھا

زمانے کا ہر اک منظر بہت گدلا تھا میلا تھا

اندھیروں کے اسی موسم میں جب نورِ محمد جگمگایا

تو ہر جانب اُجالا مسکرایا

ہوئی انوار کی پھر ایسی بارش

کہ ہر سو نور کا سیلاب آیا

جہالت کے اندھیروں کا

کہیں کوئی نگر بھی بچ نہ پایا

جہاں کا کونا کونا پھر اجالوں میں نہایا

محمد کے اُجالے کا یہی تو معجزہ ہے

کہ پھر کوئی اندھیرا ابھی

درخشاں مہر کو کب ڈھانپ پایا

کچھ اس انداز سے تھا نور احمد جگمگایا...!

احمد جلیل

خاموشی کا اعتراف

ایک نکتہ
زمان و مکاں سے جُدا
راستے مُنجمد
جیسے پتھر کوئی
کس قدر ہے رکاوٹ
انوکھی یہاں
کیسا ماحول ہے
دیکھتے دیکھتے
پھر اچانک ہوا
بند گلیوں سے رستے نکلنے لگے
خواب چلنے لگے
پھول کھلنے لگے
کُرہ اِرض پر
روشنی ہوگئی
وہ تماشا
جسے دیکھنے کی ہوس میں
تمنا
خلاؤں کے گرداب میں
یوں بھٹکتی رہی
سب کہاں کھو گیا
ہم بھی
کارِ جنوں میں
تلاطم سے آگے
ترے ہونے نہ ہونے کی جستجو میں
بھٹکتے رہے
سُرخ یاقوت سے دن
خزاں ہو گئے
شام آنکھوں میں کاٹی ہے
لیکن یہاں
رات کٹتی نہیں
اِک کہانی
پری زادلمحوں کی آغوش میں
کتنی مدہوش ہے
بات سنتی نہیں
بات کرتی نہیں

امجد بابر

ہجرت تو محبت کا پہناوا ہے

میں نے دل میں اک خوف پال رکھا تھا

کسی بہت پیارے کو کھو دینے سے بڑا دکھ

اور کیا ہوگا

میری محبت ہمیشہ کسی کو

کھو دینے کے ڈر کے حصار میں مقید رہی

یہ جانے بنا کہ کسی بھی ذی روح کو

محبت سے باندھا نہیں جا سکتا

کبھی کبھی بہت زیادہ چاہت بھی

گھٹن کا سبب بن جایا کرتی ہے

جیسے کل بلی دروازہ کھلتے ہی بھاگ گئی

بن مانگی محبت سے وہ بھی اکتا سی گئی تھی"

نظر اندازی سے کہیں تکلیف دہ

ہر پل کسی کی نظروں میں رہنا ہے

محبت بھی آزاد رہنا چاہتی ہے

من چاہی زندگی جینا

ہر ذی روح کی خواہش ہے

ہم اپنی خواہشوں کے پنجرے میں

رنگ خوشبو اور محبت کو مقید

نہیں رکھ سکتے

ہجرت تو محبت کا پہناوا ہے"

وہ ایک دل سے دوسرے دل میں

سفر کرتی ہے

اسے ثبات کہاں

محبت کیا ہے

دکھ سے عبارت

اِک اَن کہی پہیلی ہے

نائلہ راٹھور

انتخاب

- خالد احمد -

نعمان منظور

کون دیوان خالد پڑھے گا یہاں

ہم نوا کیا ، کہ اب ہم زباں بھی نہیں

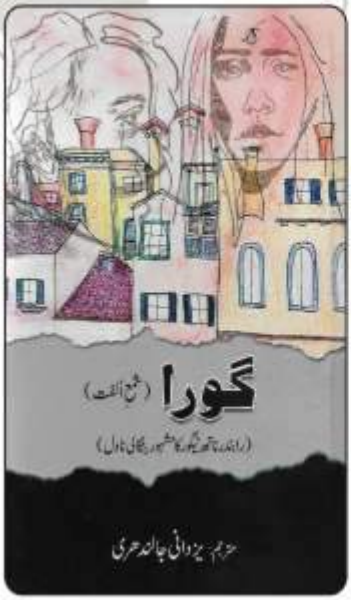

تیرے خط، تری خوشبو
ڈاکٹر اشفاق احمد ورک

گورا
مترجم یزدانی جالندھری

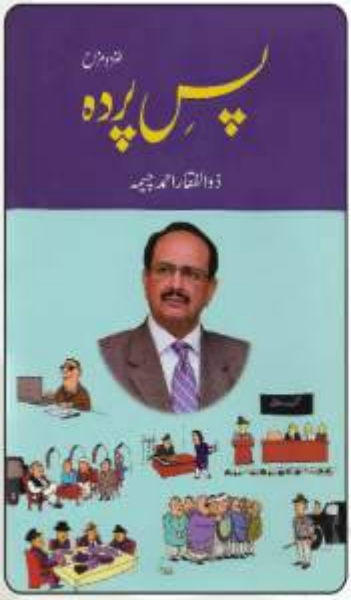

پس پردہ
ذوالفقار احمد چیمہ

محترمہ مشرف مبشر کے نام ایک شام جناب نعمان منظور، جناب نثار ترابی، محترمہ صغریٰ صدف،
محترمہ عطیہ سید، محترمہ مشرف مبشر، آغا قیصر عباس

محترمہ مشرف مبشر کے نام ایک شام جناب آفتاب خان، جناب نثار ترابی، محترمہ صغریٰ صدف،
محترمہ عطیہ سید، محترمہ مشرف مبشر، آغا قیصر عباس، جناب راجہ نیر، جناب نعمان منظور